نظامِ طاغوت سے برأت

مولانا صدرالدین اصلاحی

نوائے غزوۂ ہند

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نامِ کتاب	نظامِ طاغوت سے برأت
مصنف کا نام	مولانا صدر الدین اصلاحی
ترتیب	مرتّبین ادارہ نوائے غزوۂ ہند
تاریخِ اشاعت	رجب المرجب ۱۴۴۱ھ / مارچ ۲۰۲۰ء
ناشر	ادارہ نوائے غزوۂ ہند
ویب سائٹ	www.nawaighazwaehind.com
برقی پتہ برائے رابطہ	editor@nawaighazwaehind.com

بقلم: حضرت مولانا صدر الدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

نوائے غزوۂ ہند

فہرست

لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىَ لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ اللّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُواْ يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوُرِ وَالَّذِينَ كَفَرُواْ أَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُوْلَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ○

(سورۃ البقرۃ:۲۵۶،۲۵۷)

”دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا، اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں، اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے، وہ انہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں، وہ سب آگ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔“

الَّذِينَ آمَنُواْ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُواْ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُواْ أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفاً○

(سورۃ النساء:۷٦)

”جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ طاغوت کے راستے میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا (اے مسلمانو) تم شیطان کے دوستوں سے لڑو۔ (یاد رکھو کہ) شیطان کی چالیں در حقیقت کمزور ہیں۔“

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحمدللہ وکفیٰ والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللہ، اَمّابعد

طاغوت کیاہے؟

امام مالک[1] رحمۃ اللہ علیہ اور امام بغوی[2] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ 'اللہ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو طاغوت کہاجاتاہے'۔

حضرت امام ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ﴾ کے تحت، 'طاغوت' کا معنٰی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں 'حضرت عمرؓ کا طاغوت کو شیطان کے معنٰی میں لینا بہت ہی اچھاہے، اس لیے کہ یہ ہر اس برائی کو شامل ہے، جو اہلِ جاہلیت میں تھی (یعنی) بتوں کی پوجا کرنا اور انہی (بتوں والے نظام) کی طرف فیصلے کرنے کے لیے رجوع کرنا'[3]۔

---

[1] بحوالہ تفسیر معارف القرآن از مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ

[2] بحوالہ تفسیرِ بغوی

[3] تفسیرِ ابنِ کثیر

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ 'طاغوت سے مراد اللہ کے سوا دوسرے تمام معبود (ہیں) یا وہ معبود جو اللہ کی عبادت سے مانع ہوں خواہ جن شیطان ہوں یا انسان'[1]۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک فتوے؛ جس کا عنوان ہے 'خلافِ شرع حکم کرنے والے حکمران طاغوت ہیں، ان کو ''اولی الامر'' میں داخل کرنے والے کی امامت ناجائز ہے' میں فرماتے ہیں کہ 'انگریزی قانون کے ماتحت خلاف شرع حکم کرنے والے خواہ غیر مسلم ہوں، خواہ نام کے مسلمان؛ طاغوت ہیں'۔[2]

مندرجہ بالا اقوال 'طاغوت' کی حقیقت اور معنیٰ کو بیان کرنے میں کافی و شافی ہیں۔ یہ ہے وہ 'طاغوت' جو پچھلی ایک صدی میں شخصیات کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ایک 'نظام' کی صورت و حیثیت بھی دھار گیا ہے۔ اللہ وحدہٗ لا شریک سے باغی اور اللہ وحدہٗ لا شریک کے مقابل تراشیدہ، اسی طاغوت کے نظام سے بغاوت؛ رسالۂ ہٰذا کا موضوع ہے، جسے حضرت مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

اس رسالے میں اولاً طاغوت کی حیثیت، مثالوں کے ذریعے بیان کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ طاغوت دراصل 'جاہلیت' ہے۔ پھر اس 'جاہلیت' کے ساتھ دینِ اسلام کا رویہ بیان کیا گیا ہے کہ آیا یہ جاہلیت اسلام کو گوارا ہے یا نہیں؟ بعداً جہاں جہاں 'نظامِ جاہلیت' نافذ ہے، یعنی وہ نظام جہاں اللہ کی شریعت کے علاوہ کچھ بھی نافذ[3] ہے تو اس کے محکوم مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہیں؛ ان کی ضروریات و مجبوریوں کا ادراک کرتے ہوئے شریعت کس قدر اس 'نظامِ طاغوت' میں شرکت و تعاون کی اجازت دیتی ہے، پھر اس معاونت یا شرکت کے کیا درجات ہیں...... دستور سازی و قانون سازی کی کیا حیثیت ہے؟ نظامِ طاغوت کی خاص ملازمتیں جن سے نظام کو تقویت ملتی ہے، ان کی کیا

---

[1] تفسیرِ مظہری

[2] کفایت المفتی، جلد اول

[3] اس خاص جاہلیت کی تعریف سے فی الحال سروکار نہیں ہے، چاہے یہ جاہلیت جمہوری سیکولر (لادین) سرمایہ دارانہ نظام ہو یا آمرانہ سوشل ازم یا اس وقت بعض جگہوں پر 'اسلامی' جمہوریت کا نظام...... وہ اسلامی جمہوریت جس میں انسان ہی کہتے ہیں کہ ہم نے اقتدارِ اعلیٰ اللہ کے حوالے کر دیا اور پھر قانون سازی سے لے کر عدالتوں میں فیصلوں تک غیر اللہ کے سیکڑوں مظاہر کو جواز بخشتے ہیں۔

حیثیت ہے؟ اور اس نظام میں عام ملازمتوں کی حیثیت کیسی ہے؟ کس کو اس نظام میں شامل ہو کر رخصتِ شرعی مل سکتی ہے اور اس کی کیا واقعی صورتیں ہیں؟

پھر آج کل ایک صورت 'قومی مفاد' بھی ہے۔ "أهون البليتين" یعنی دو بلاؤں میں سے کسی ایک بلا جو آسان بھی ہو کو اختیار کرنا؛ لہٰذا فی الوقت اس 'سپر' کو کیسے استعمال کیا جا رہا ہے اور موجودہ طاغوتی نظاموں میں رہ کر 'حضرتِ سیدنا یوسف علیہ الصلاۃ والسلام' کے اسوے کا استعمال کیسے ہو رہا ہے کہ وہ (اپنے زمانے کے) فرعونِ مصر کے تابع تھے سو ہمیں بھی گنجائش حاصل ہو جاتی ہے کہ ہم موجودہ نظاموں کے تحت کارِ حکومت میں شریک ہو جائیں۔ نیز پیشوایانِ دین کی خصوصی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ان سب پر احسن طریق سے بیان اس رسالے میں کیا گیا ہے۔

یہ سب موضوعات جن کا اصل محور 'نظامِ طاغوت سے برأت' ہے، بدقسمتی سے یا بعض جگہ 'ہماری' اپنی ہی چاہت سے آج ہمارے یہاں مفقود ہو گئے ہیں۔ ہمارے ممالک میں موجود نظاموں کو یا تو 'اسلامیایا' جا چکا ہے یا پھر کتنے ہی ہیں جنہیں اس امر کی پرواہی نہیں کہ ان نظاموں کی حیثیت کیا ہے اور ان خدا کے باغی و منکر اور شیطان و عباد الشیطان کے وضع کردہ اور شیطان کے پجاری نظاموں سے برأت و بغاوت لازمی ہے۔

مولانا صدر الدین اصلاحی اعظمی (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ مضمون 'نظامِ طاغوت سے برأت' سنہ ۱۹۵۱ء میں تحریر فرمایا تھا اور یہ مضمون ماہنامہ 'زندگی' (رام پور، ہندوستان) کے ۱۹۵۱ء کے نومبر و دسمبر اور ۱۹۵۲ء کے ماہِ جنوری میں قسط وار شائع ہوا۔

اسی مضمون کو دوبارہ کمپوز کر کے، ترتیبِ جدید اور اردو کی فی زمانہ مروجہ املا کے ساتھ مجلّہ 'نوائے افغان جہاد[1]' میں قسط وار شائع کیا گیا اور اب یک جا کر کے 'نوائے غزوۂ ہند' کے پلیٹ فارم سے نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔

---

[1] 'نوائے افغان جہاد'؛ مجلّہ 'نوائے غزوۂ ہند' کا سابقہ نام۔

اس رسالے میں جہاں جہاں حاشیے درج ہیں تو وہ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کے اپنے تحریر کردہ ہیں۔ ایک دو مقامات پر 'ناشر ماہنامہ زندگی' کے حاشیے بھی موجود ہیں جن کے آگے 'ناشر' کے دستخط درج ہیں۔ دو چار مقامات پر ہم نے بھی وضاحتی حاشیوں کا اضافہ کیا ہے، جن کے سامنے 'مدیر نوائے غزوۂ ہند' کے دستخط موجود ہیں۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو امتِ مسلمہ خصوصاً اہالیانِ برِّصغیر کے لیے نافع بنائے۔ اللہ پاک ہمیں ہر طاغوت کے سامنے کلمۂ حق کہنے اور اس سے برأت وبغاوت کرنے والا بنائے، آمین یاربّ العالمین!

وصلی اللہ علی النبی، وآخر دعوانا أن الحمد للہ ربّ العالمین۔

مدیر ادارہ 'نوائے غزوۂ ہند'

رجب المرجب ۱۴۴۱ھ / مارچ ۲۰۲۰ء

◆◆◆◆◆◆◆

نظامِ طاغوت سے برأت

حضرت مولانا صدر الدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

اسلام اور جاہلیت کا فطری تضاد

ہر شے اپنے ضد کی دشمن ہوتی ہے۔ اس کا موجود ہونا اس بات کو لازم ہے کہ اس کی ضد معدوم ہو۔ روشنی وہاں نہیں پائی جا سکتی جہاں تاریکی مسلط ہو، اس کے پائے جانے کے لیے ضروری ہے کہ اس جگہ سے تاریکی کافور ہو جائے۔ یہ عقل اور منطق کی بدیہیّات میں سے ہے۔ اسلام بھی ایک مثبت حقیقت ہے، اور وہ بھی اپنا ایک ضد رکھتا ہے، جس کو اس کی زبان میں جاہلیت، طاغوت اور باطل وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب ہر شے اپنے ضد کی دشمن ہوتی ہے تو عقل کہتی ہے کہ اسلام بھی اپنے ضد کو گوارا نہیں کر سکتا اور اگر دنیا میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جو اپنے ضد کے ساتھ ہم سری کر سکے، اس سے گلے مل جائے اور اس کی موجودگی میں خود موجود رہے تو اسلام کے بارے میں یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جائے گا، لازماً جہاں اسلام ہو گا وہاں جاہلیت نہ ہو گی اور جس گوشے میں جاہلیت ہو گی وہاں اسلام نہ ہو گا۔ جبر کی بات دوسری ہے۔ معذوریوں کی بحث کو ابھی نہ چھیڑیے۔ اپنی ذمہ داریوں کا سوال بھی ابھی خارج از گفتگو رکھیے۔ اس وقت کہنا صرف یہ ہے کہ اصولی طور پر اسلام وہیں ہو گا جہاں غیر اسلام نہ ہو گا، جہاں کفر نہ ہو گا، جہاں شرک نہ ہو گا، جہاں الحاد نہ ہو گا، جہاں طاغوت کی پوجا نہ ہو گی، جہاں جاہلیت کی کار فرمائی نہ ہو گی۔ دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا بداہتاً غلط اور ناممکن ہے۔ تضاد ان کی عین فطرت میں ہے اور تصادم اس فطرت کا عین مقتضا ہے۔

تضاد کی حدیں

کیا اس تضاد اور تصادم کی کچھ حدیں بھی ہیں؟ کیا کچھ خاص دوائر ہیں کہ صرف انہیں کے اندر یہ دونوں باہم نبرد آزما ہوتے اور اپنے حریف کو نیست و نابود کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور باہر کی دنیا میں ایک دوسرے کے وجود یا عدم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا؟ کیا ہماری زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں جہاں یہ ضدّین، یہ دونوں حریفِ ازل اپنی اپنی ہستی کے لیے کشمکش کرتے ہیں اور باقی ساری زندگی اس کشاکشِ پیہم سے محفوظ ہے؟ آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں اس سوال

کا نہایت واضح جواب معلوم کرلینا چاہیے، کیونکہ بڑی حد تک اس جواب پر نتیجہ کی نوعیت موقوف ہے۔ اگر یہ جواب اثبات میں ہے تو فیصلے کی نوعیت بالکل دوسری ہوگی، یعنی ہمیں بلا کسی دلیل و برہان کے یہ مان لینا پڑے گا کہ اسلام اور جاہلیت میں توافق کے کافی امکانات ہیں، زندگی کے چند مخصوص شعبے اگر مسلسل اور نا قابلِ مصالحت تصادم کے میدان ہیں تو کیا ہوا؟ متعدد شعبے ایسے بھی ہیں جہاں ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں، ایک دوسرے سے نہ کوئی تعرض ہے، نہ اس کی ذات سے کوئی پرخاش۔ لیکن اگر جواب نفی میں ہو تو صورتِ حال یکسر پلٹ جاتی ہے، اور دونوں کا تصادم مقامی اور محدود نہیں رہ جاتا بلکہ عام اور ہمہ گیر اور حدود نا آشنا ہو جاتا ہے۔

اس ''نفی یا اثبات'' کا فیصلہ صرف ایک بات پر، بلکہ یوں کہیے کہ ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے، اور وہ یہ کہ خود اسلام کیا ہے؟ اس کی حدودِ اثر و عمل کیا ہیں؟ انسانی زندگی کے کتنے گوشوں سے وہ تعلق رکھتا اور بحث کرتا ہے؟ اگر بات یوں ہو کہ اسلام ہماری زندگی کے صرف بعض ہی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو محض ہمارے تھوڑے سے عقائد مابعد الطبیعی اور چند رسومِ مذہبی سے واسطہ ہے تو مذکورہ بالا بحث کا فیصلہ یقیناً اثبات میں ہے اور ہمیں ماننا ہوگا کہ اسلام اور جاہلیت میں تعاون یا کم از کم پر سکون عدمِ تعرض کا ایک بڑا وسیع میدان موجود ہے۔ لیکن اگر امرِ واقع یوں ہو کہ اسلام ہماری زندگی کا ایک مکمل رہنما اور نگراں ہے، اور وہ ہمیں ایک جامع دستورِ حیات دے کر اس کی مکمل پیروی کا مطالبہ کرتا ہے تو فیصلہ بھی نفی میں ہوگا، اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام اور جاہلیت کی معاندانہ کشمکش نہ کبھی ختم ہونے والی ہے، نہ کسی خاص دائرے تک محدود ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اسلام کی حدودِ اثر و عمل کیا ہیں؟ تو جس شخص کی بھی نظر اسلام کے اصل مآخذ، کتاب اور سنت پر ہوگی، وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اسلام صرف عقائد و عبادات کا نام نہیں بلکہ اس کی وسعتوں میں پوری حیاتِ انسانی، بلکہ ساری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ وہ ایک جامع دستور اور مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے جملہ اطراف کو، اس کے عقائد و نظریات کو، اس کے رسوم و عبادات کو، اس کے تمدنی اور معاشرتی معاملات کو، غرض سارے ہی انفرادی و اجتماعی مسائل کو محیط ہے۔ اس کے پاس اپنا ایک نظامِ تمدن اور ایک نظامِ حکومت ہے۔ وہ دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ حیاتِ انسانی کا پورا نقشہ اسی کے اصول اور خاکے پر مرتب ہو اور لوگ نہ صرف اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر خدا کی پرستش ہی کریں بلکہ اسی کے دیے ہوئے دستور کے مطابق اپنی پوری کی پوری زندگی بسر کریں۔

گھریلو معاملات اس نہج پر انجام پائیں جو اس نے بتایا ہے، لین دین ان حدود کے اندر ہو جو اس نے قائم کی ہیں، بستیوں اور مملکتوں کا نظمِ سیاست وہ ہو جو اس کے آئین میں موجود ہے، حکومت اس طرح کی جائے جس طرح اس کی ہدایت کا تقاضا ہے، معاملات کے فیصلے ان قوانین کے مطابق کیے جائیں جو اس کی کتاب میں درج ہیں، وہاں کٹ جاؤ جہاں وہ کٹ جانے کا حکم دیتا ہو اور وہاں جڑ جاؤ جہاں اس کا منشا ہو کہ جڑ جایا جائے۔ اس کو برحق ماننا یا نہ ماننا ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسلام اپنے منہ سے ایسا ہی کچھ ہے۔ وہ فی الواقع انسان کی پوری زندگی پر بلا شرکتِ غیرے فرماں روائی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی اس کّلیت پسندی پر کوئی جمہوریت کا دلدادہ اگر احتجاج کرنا چاہے تو کرلے، مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ حقیقتِ اسلام کی یہ ترجمانی صحیح نہیں ہے۔ ہمیں جس طرح اسلام کی حقانیت پر یقین ہے اسی طرح اس کی جامعیت کا بھی اِذعان (اقرار) ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہر مسلمان اس اِذعان میں ہمارا برابر کا شریک ہے، اس لیے خاص اس نظریے نہیں، بلکہ عقیدے پر کوئی ثبوت پیش کیے بغیر ہم آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں کم از کم ہر مسلمان کے نزدیک یہ ایک مسلّم حقیقت ہے، اس پر ثبوت مہیا کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ تاہم اگر کچھ لوگ اس کے خلاف گمان رکھنے والے ہوں تو ہم ان سے معذرت کریں گے کہ وہ اس وقت سرے سے ہمارے مخاطب ہی نہیں، بلکہ ہمارا یہ تخاطب تمام تر صرف ان لوگوں سے ہے جو کم از کم اس مسئلے پر ہمارے ساتھ ہیں۔

جب یہ بات معلوم ہے کہ اسلام ہماری پوری زندگی پر حاوی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام اور جاہلیت کا فطری تضاد ہر چہار طرف کارفرما ہوگا، کوئی سمت نہ ہوگی جہاں ان میں تصادم اور مسلسل کشمکش نہ ہو، جہاں اس تضاد و تصادم کے لازمی نتائج نمودار نہ ہوں، اور جہاں ایک وجود یہ معنیٰ نہ رکھتا ہو کہ ازروئے حقیقت دوسرا معدوم ہے۔ غرض جب اسلام زندگی کے سارے شعبے اپنے زیرِ نگیں رکھنا چاہتا ہے تو کسی شعبے میں اس کے سکے کا نہ چلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کفر و جاہلیت کا محروسہ[1] ہے، اور ایسا ہونا اسلام کے لیے فطری طور پر ناقابلِ برداشت ہے، ہمیشہ کے لیے

[1] حفاظت کرنے والا۔ (مدیر 'نوائے غزوۂ ہند')

ناقابلِ برداشت، خواہ اس کے پست ہمت پیرومرورِ زمانہ سے اپنے احساس کی لطافت کیوں نہ کھو بیٹھیں، اور رفتہ رفتہ اس نادیدنی صورتِ حال کو معمولی اور قابلِ برداشت ہی کیوں نہ سمجھ لیں۔

جاہلیت کے ساتھ اسلام کی پالیسی

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی پہلی اینٹ بھی نہیں رکھی جاتی جب تک جاہلیت سے کلّی علیحدگی اور بے زاری نہ ہو جائے۔ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ اس عقیدۂ توحید کا اظہار جن لفظوں میں کیا جاتا ہے وہ لا الٰہ الا اللہ کے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کا جائزہ لیجیے اور ان کے معانی پر غور کیجیے۔ بات یوں نہیں فرمائی گئی کہ "اللہ ایک ہے" (اللہٗ احد) بلکہ اس طرح کہی گئی ہے کہ "نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے"۔ معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم اسلام کی بنیاد رکھنے سے پہلے جاہلیت کی بیخ کنی ضروری سمجھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معبودیت کے اثبات پر ہر غیر اللہ کی نفی کو مقدم ٹھہراتا ہے۔ ٹھیک یہی بات ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ:

فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ (سورۃ البقرہ:۲۵۶)
"جو شخص طاغوت سے کفر کرتا ہے اور اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔"

حقیقتِ توحید کی ان قرآنی تعبیرات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنائے اسلام و ایمان میں "طاغوت سے کفر" یعنی جاہلیت سے کنارہ کشی کی کیا اہمیت ہے۔ اگر کوئی منفی حقیقت کسی مثبت شے کی بنیاد ہو سکتی تو بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا تھا کہ اسلام کی خشتِ اول جہل و طاغوت کا یہی انکار ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ کا ذکر بھی قرآن مجید کفر بالطاغوت کے بعد کرتا ہے، اور یہ ٹھیک اس کلّی ضابطے کے مطابق ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ یعنی یہ کہ کسی شے کے وجود کے لیے اس کے ضد کا معدوم ہونا ضروری ہے، اس لیے ایمان باللہ کا وجود اس امر کو مستلزم ہے کہ ذہن ایمان بالطاغوت کی نجاستوں سے آگاہ ہو چکا ہو۔

یہ تو ہوا اسلام اور جاہلیت کے مکمل تضادِ فطری کا اجمالی بیان، اسی پر تفصیلات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ یہ ایک نہایت موٹی سی بات ہے کہ جن دو چیزوں میں بنیادی اختلاف اور فطری تضاد ہو ان کے لوازم، تفصیلات اور جزئیات کے اندر بھی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ بنیاد کا اختلاف جتنا گہرا اور سنگین ہو گا، فروع میں ہم آہنگی اتنی ہی زیادہ ناممکن ہو گی۔ اسلام اور

جاہلیت میں جو زبردست فطری تضاد ہے وہ آپ پر روشن ہے، ایسی صورت میں یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام جاہلیت کی مختلف صورتوں میں کسی صورت کو، اس کے بے شمار لوازم میں سے کسی لازمے کو اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا اذن دے گا! چنانچہ اس نے نہ صرف یہ کہا ہے کہ ان کے قریب نہ جاؤ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ان کے ارتکاب میں معاونت تک نہ کرو، کہ جبینِ ایمانی پر یہ ایک شرم ناک داغ ہو گا:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورۃ المائدۃ:۲)

"گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔"

گناہ اور ظلم و زیادتی کے کام، اور جاہلیت کے کام، دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ بقول امام بخاری المعاصي من امر الجاهلية (معصیتیں جاہلیت کے کام ہیں)[1] اس لیے اگر اس آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے تو کوئی فرق نہ واقع ہو جائے گا کہ "جاہلیت کے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو"۔

اس پالیسی کی عملی مثالیں

گناہ اور زیادتی کے کاموں میں یا جاہلیت کے کاموں میں تعاون نہ کرنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ اس کی عملی شرح کیا ہے؟ اسے مثالوں کے ذریعے اور خود ارشاداتِ رسول ﷺ کی روشنی میں دیکھیے۔

سود خوری جو ایک گناہ کا کام ہے اور جاہلیت کا لازمہ، اس کے بارے میں حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ:

"لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء."[2]

---

[1] بخاري، كتاب الايمان

[2] صحيح مسلم، كتاب الساقاة و المزارعة، باب الربا

"اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے سود لینے والے پر، سود دینے والے پر، سودی دستاویز لکھنے والے پر اور سودی معاملے کے گواہوں پر، اور فرمایا کہ یہ اس گناہ میں یکساں شریک ہیں۔"

ایک دوسرے گناہ شراب خوری کے متعلق آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"لعن الله الخمر و شاربها و ساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها و حاملها والمحمولة اليه."[1]

"اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے نچڑوانے والے پر، اس کے اٹھاکر لے جانے والے پر اور اس شخص کے اوپر جس کے یہاں لے جاکر رکھی جائے۔"

ان الفاظ سے اندازہ کیجیے کہ گناہ تو گناہ، اعانتِ گناہ بھی کتنی مہلک چیز ہے۔ اوراعانت بھی کیسی اعانت؟ بس کسی شرابی کو شراب کا پیالہ تھما دیجیے، یا بازار سے خرید کر لا دیجیے، یا کشید کر دیجیے، کسی سودی دستاویز کو لکھ دیجیے یا اس پر گواہی کا دستخط بلکہ صرف انگوٹھے کا نشان ہی دے دیجیے۔ کیا معاذ اللہ، خاکم بدہن یہ رسولِ خدا ﷺ کا نرا جوشِ خطابت تھا جو آپ نے شراب اور سود کے بارے میں ایسے تیز و تند کلمات ارشاد فرمائے ہیں؟ حاشا و کلا، کہ کسی ایسی بدگمانی کا کوئی مسلمان تصور بھی کر سکے۔ یقیناً آپ نے ان کلمات میں دین کی وہی اصولی حقیقت بے نقاب فرمائی ہے جس کا آیت مذکورہ بالا سے اجمالی تعارف ہوتا ہے۔ درحقیقت ان دونوں حدیثوں کی حیثیت اسی آیت **وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** کی مثال کی سی ہے اور انہی پر دوسرے امورِ معصیت کو قیاس کرنا چاہیے۔

یہ گمان نہ ہو کہ چونکہ دوسرے معاصی کا آپ نے اس طرح ذکر نہیں فرمایا ہے، اس لیے کیا عجب جو یہ وعید انہی دو چیزوں کے حق میں مخصوص ہو۔ کیونکہ یہ گمان اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ احکامِ شرع اور

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب العسب بعصر الخمر

ہدایاتِ رسول میں نیکی، بدی یا نفع و نقصان کا کوئی بنیادی فلسفہ کام نہیں کر رہا ہوتا ہے اور وہ اپنی تہہ میں نہ کوئی سِر رکھتے ہیں نہ کوئی علت۔ مگر کون مسلمان ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں اس گستاخی اور دریدہ دہنی کی تاب لاسکتا ہے؟ پس یہ حقیقت سے بہت بعید ہے کہ یہ شدت وعید صرف انہی دو چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ یہ کسی متعین اصول کے تحت ہے نہ یہ کسی خاص علت کی بنا پر۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسا جو فرمایا گیا تو اسی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے اصول کے تحت فرمایا گیا، اور سودی معاملات کی دستاویز نویسی اور گواہی جیسی بظاہر بالکل معصوم باتوں کو اگر سزاوارِ لعنت بنایا گیا تو اس لیے کہ اگرچہ وہ بجائے خود معصیت نہیں مگر ان میں ارتکابِ معصیت کی معاونت پائی جاتی ہے۔ اور جب حقیقتِ نفس الامری یہ ہے تو کھلی بات ہے، جہاں بھی علت پائی جائے گی اور جس جگہ بھی یہ اصول تعاون منطبق ہوتا نظر آئے گا وہاں لازماً یہی حکم لگایا جائے گا جو سود و شراب کے سلسلے میں لگایا گیا ہے۔ یہ خفی نہیں بلکہ نہایت جلی قیاس ہوگا۔ ہاں! نہ سارے گناہ ایک درجے کے گناہ ہیں، نہ ان کی اعانت ہی یکساں درجے کی معصیت ہے، حتیٰ کہ خود ایک گناہ کی اعانت کی جو مختلف شکلیں ہوتی ہیں، ان سب کی شناعت بھی ہم مرتبہ نہیں۔ شراب پینے والے کے حصے میں جو لعنت آئے گی وہ پلانے والے کے حصے نہیں ہو سکتی، سود خوار جس غضب الٰہی کا مستحق ہے گواہ اس کا سزاوار نہیں بن سکتا۔ اس طرح جو گناہ شراب نوشی اور سود خوری سے نسبتاً ہلکے گناہ ہیں ان کی سزا بھی ان کے برابر نہ ہوگی، اور نہ ہی ان کے ارتکاب میں تعاون اس درجے کا ملعون فعل ہوگا جس درجے کا ملعون فعل اس کے ارتکاب کا تعاون ہے۔ مگر بااین ہمہ یہ بات اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ گناہ خواہ کوئی ہو اس کے ارتکاب میں معمولی سے معمولی تعاون بجائے خود ایک گناہ ہے، جاہلی حرکت ہے، جرم ہے اور اسلام کے خلاف جرم ہے۔

امثلۂ مذکورہ کا سببِ انتخاب

لیکن اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ ضرور قابلِ غور ہے کہ وہ کیا خاص بات تھی جس کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے تعاون علی الاثم کی تفصیل بیان کرنے کے لیے بطور مثال انہی دو امورِ معصیت کو منتخب فرمایا؟ تو بات دراصل یہ تھی کہ یہ وہ جرائم ہیں جو اہلِ عرب کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے، نسلوں سے لوگ ان کے رسیا چلے آرہے تھے، ان کے نظام معاش و تمدن میں یہ ریڑھ کی ہڈی بن چکے تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ان کی بابت فسق و معصیت ہونے

کا تصور بھی ذہنوں سے محو ہو چکا تھا۔ سود کے بارے میں ان کا یہ معاشی تبصرہ قرآن میں اب تک محفوظ ہے کہ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا "بیع و شرا تو سود ہی کے ہم مثل ہیں" (البقرہ:۲۷۵)۔ رہا شراب کا معاملہ، تو کچھ نہ پوچھیے کہ یہ اُم الخبائث ان کی نگاہ میں کتنی بے شمار اخلاقی اور مادی محاسن کا پیکر تھی۔ رِبا تو خیر حدِ اباحت کے اندر ہی تھا اور اسے صرف ایک ناگزیر تمدنی و معاشی ضرورت کا نام دے کر مقبولِ عام بنا دیا گیا تھا مگر اس جام و ساغر نے تو دینی تقدس پر بھی چھاپے مار رکھے تھے۔ شراب خوری عربی اخلاقیات میں اباحت کے مقام سے اٹھ کر استحسان کے مقام تک جا پہنچی تھی، بلکہ اس سے بھی آگے کسی اور بلند درجے پر فائز تھی۔ یعنی وہ ان کے خیال میں مکارمِ اخلاق کا سرچشمہ تھی، اس سے سخاوت، دریا دلی اور غربا پروری کے سوتے پھوٹتے تھے، وہ جسم میں شہامت اور جاں بازی کی بجلیاں بھر دیتی تھی۔ بھلا ایسی مقوّیٔ بدن ہی نہیں بلکہ "مقوّیٔ اخلاق" شے بھی قابلِ نفرت ہو سکتی ہے! چنانچہ جب قرآن نے ابتداءً اس کے مفاسد کی طرف اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہا تو اہل جاہلیت کو نہیں، خود اہل اسلام کو ایک تعجب سا ہوا۔ اور جنابِ رسالت ﷺ میں یہ سوال پیش کر ہی دیا گیا کہ "شراب کے بارے میں آخر شریعت کیا کہتی ہے؛ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (سورۃ البقرۃ:۲۱۹)"؟ مطلب یہ تھا کہ شراب صفات عالیہ کا ایک زبردست ذریعہ ہے، خالص دینی نقطۂ نگاہ سے بھی اس میں غیر معمولی فائدے ہیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے حق میں وحی کے تیور بدلے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ "اس میں بلاشبہ بہت سے خیر و منفعت کے پہلو ہیں، دنیوی اور مادی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ خالص اخلاقی اور دینی حیثیت سے بھی، مگر ان وجوہِ خیر کے مقابلے میں اس کے اندر جو وجوہِ شر ہیں، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں"۔ اس لیے اس کو ایک مستحسن فعل اور عادت سمجھنے کے فریب میں نہ رہو۔ اسے آج نہیں تو کل چھوڑنا ہی پڑے گا۔ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا "تو کہہ، ان میں گناہ بڑا ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کو، اور ان کا گناہ فائدے سے بڑا ہے" (سورۃ البقرۃ:۲۱۹)۔

آپ جانتے ہیں کہ جو برائیاں بھلائیوں کا روپ اختیار کر لیتی ہیں اور سوسائٹی میں ان کو بہ نظر استحسان دیکھا جانے لگتا ہے ان کا رشتہ جذبات سے کتنا گہرا اور مستحکم ہوتا ہے اور وہ کس طرح لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہیں۔ اس لیے ایسی برائیوں کا مٹانا بڑا ہی دشوار کام ہے، اور بڑی حکمتوں سے انجام پاتا ہے۔ چنانچہ شراب اور سود کے بارے میں جو خاص رویہ شارعِ حکیم نے اختیار فرمایا کہ بتدریج اسے حرام کیا، وہ دراصل اسی وجہ سے تھا۔ اور جب

پوری سوسائٹی کی اچھی طرح ذہنی تربیت کر لینے کے بعد ان اشیا کی قطعی حرمت کا آخری فرمان جاری ہو گیا تو ضروری تھا کہ آئندہ کے لیے ان خیر نما مفاسد کی طرف جانے کے سارے دروازے انتہائی مضبوطی کے ساتھ بند کر دیے جائیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے، جو معلّمِ حکمت بھی تھے اور مزکیٔ نفوس بھی، وہ الفاظ فرمائے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور اس طرح کی وعیدیں سنائیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔

ایک اصولی نکتہ

مخصوص طور پر شراب اور سود کے بارے میں شارع علیہ السلام کی یہ شدت نکیر اصولِ تشریع کے ایک اہم نکتے کا پتہ دیتی ہے، اور وہ یہ کہ بعض گناہوں کی شناعت اگرچہ بجائے خود بہت زیادہ نہ ہو، مگر بعض خارجی مصالح اور عوارض ایسے ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر شناعت المضاعف ہو جائے، یہاں تک کہ وہ ضرب المثل بن جائے۔ مخصوص مصالح سے قطعِ نظر شراب اور سود کا اپنا ذاتی مفسدہ قتل اور زنا جیسے گناہوں سے بہت ہلکا ہے۔ لیکن ان خاص اسباب و عوارض کی وجہ سے، جن کا اوپر ذکر ابھی گزرا، شراب نوشی اور سود خوری کو ایسے مسلّم گناہوں سے بھی بدتر معصیت قرار دیا گیا، حتیٰ کہ ایک درہم سود کھانا چھتیس بار زنا کرنے سے بھی زیادہ قبیح فعل ٹھہرایا گیا[1] اور عادی مے نوش کی موت کو، اگر اس نے توبہ نہ کی، بت پرست کی موت سے تشبیہ دی گئی[2]۔ ایسا کیوں ہوا؟ محض اس بنا پر کہ ان چیزوں کی بابت یہ تصور ہی بھلا دیا گیا تھا کہ وہ کوئی گناہ کے کام ہیں، اور ایک مدت سے ان کے بارے میں یہ گمان کیا جا رہا تھا کہ یہ تو ناگزیر تمدنی اور معاشی ضرورتیں ہیں اور فی الواقع دین و دیانت کے دائرۂ بحث میں ہیں بھی نہیں، یا پھر یہ مکارم اخلاق کا ذریعہ ہیں۔ گویا اصول یہ ٹھہرا کہ خواہ کوئی اپنی جگہ کم وزن ہی کیوں نہ ہو مگر جب اس کو قبول عام حاصل ہو جائے، اس کو معاشرت اور معاش کی ناگزیر ضرورت کی حیثیت دے دی جائے، اس کو اخلاقی فضائل کا موجب قرار دے دیا جائے تو اس کا وزن اپنی عام فطری مقدار سے کہیں زیادہ ہو جائے گا۔ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے، ایک

---

[1] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”درهم ربوا یاكله الرجل وهو یعلم اشد من ستة ثلثین زینة۔“ (مسند احمد، المجلد الخامس، صفحہ ۲۲۵، سنن الدار القطنی، کتاب البیوع، حدیث نمبر ۴۵)

[2] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”مدمن الخمر ان مات لقی اللہ تعالیٰ کعابدِ وثن۔“ (مسند احمد بن حنبل، المجلد الثانی، ص ۲۷۲)

چھوٹی سی نیکی بھی بسا اوقات مدارِ ایمان نظر آنے لگتی ہے، جب اس کو عام طور سے عملاً بے وقار سمجھ لیا جائے۔ ایک مٹی ہوئی سنت رسول ﷺ کا از سرِ نو زندہ کرنے والا سو شہیدوں کا ثواب پاتے اگر سنا گیا ہے تو اسی بنیاد پر، اور اگر کبھی مسح علی الخفّین تک کو ایمانیات کے بیان میں شاملِ فہرست کیا گیا ہے تو اسی اصول کے تحت۔ ورنہ بجائے خود کہاں راہِ حق میں جانِ عزیز کا سو بار نثار کرنا اور کہاں کسی ایک جزوی سنت کا اتباع! کہاں ایمان کہاں موزوں کا مسح!

نظامِ جاہلیت کے محکوم مسلمان

ان چند اصولی مقدمات کے بعد اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اگر شامتِ اعمال سے کوئی مسلم گروہ کسی نظامِ جاہلی کا محکوم بن جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ اس نظام کو کس نگاہ سے دیکھے؟ اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے، تعاون کا یا عدمِ تعاون کا؟

مناسب ہوگا کہ اس مہتم بالشان مسئلے پر غور کرنے سے پہلے ہم نظامِ جاہلیت یا نظامِ غیر اسلامی کا مفہوم ذہن میں تازہ کر لیں، اور جس وقت ہم کوئی رائے قائم کرنے جا رہے ہوں اس وقت یہ حقیقت ہماری نگاہوں کے سامنے اپنی پوری اہمیت کے ساتھ موجود ہو کہ کسی غیر اسلامی نظام میں حکومت و سیاست کی بنیاد وہ نہ ہوگی جو اسلام نے مقرر کی ہے، حقِ حاکمیت اللہ تعالیٰ کا تسلیم نہ ہوگا، منبعِ قانون کتاب و سنت نہ ہوگی، دیوانی اور فوجداری کے قانون اسلام کے نہ ہوں گے (اور بعض کی شکل اسلامی ہوئی بھی تو اس کی بنا ہرگز اسلام کی نہ ہوگی)، آئینی اور غیر آئینی امور یعنی حلال و حرام کی تعیین شریعت محمدی سے بے نیاز ہوگی، مختلف مسائلِ زندگی میں اربابِ اقتدار کا فیصلہ ہی فیصلہ ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اس میں مشورہ دینے تک کا بھی کوئی اختیار نہ ہوگا، حتیٰ کہ خود مسلمانوں کے نجی اور اندرونی معاملات (پرسنل لاز) میں بھی انہیں "اسلام" پر عمل کرنے کی جو آزادی ہوگی وہ حقیقتاً اس بنیاد پر نہ ہوگی کہ یہ ان کے "حقوق" ہیں بلکہ اس لیے ہوگی کہ اس نظامِ جاہلیت نے اپنے مغلوب حریف (اسلام) کو از راہِ شفقت اس حد تک سانس لینے کی اجازت دے رکھی ہے۔

جس نظامِ جاہلی کا ہیولیٰ یہ ہو، اس کی صورت کو خواہ کتنا ہی دل کش بنا کر کیوں نہ پیش کیا جائے، ایک مردِ مومن، مومن ہوتے ہوئے اس پر ریجھ جانے کے لیے آخر اپنے آپ کو کتنا فریب دے؟ جس نظام کے اندر دستور یہ،

انتظامیہ، عدلیہ، سارے ہی کلیدی ادارے خدا فراموش انسانوں کے خود ساختہ اصولوں پر قائم ہوں، اسے ایک پیروِ اسلام کس نگاہ سے دیکھے؟ اگرچہ اس کا جواب طبعاً کچھ خوش گوار نہیں، مگر اس کے سوا اور کوئی جواب ممکن بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس اسلام کا تعاون علی الاثم کے بارے میں وہ رویہ ہو جس کی ایک جھلک بعض لوازمِ جاہلیت کے سلسلے میں ابھی آپ نے دیکھی' وہ اس مجسم جاہلیت کے ساتھ تعاون کا نام بھی سننا کب گوارا کرے گا! ہاں اگر زندگی کے ان دائروں میں اس کے اپنے کچھ اصول و قوانین نہ ہوتے تو بلاشبہ اس ناگواری کی کوئی وجہ نہ تھی، مگر جب یہ ایک مسلّم بات ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جہاں اسلام "حاضر و ناظر" نہ ہو تو اس ناگواری کا ہونا ہر حال میں لازم ہے۔ غرض یہ ممکن نہیں کہ ایک مومن کسی بھی نظام جاہلی سے سکونِ قلب کے ساتھ تعاون کر سکے۔ ایک ہی سانس میں وہ اسلام کا نمائندہ اور علم بردار بھی ہو اور اس کے حریف کا خیمہ بردار بھی، یہ ایک ناقابل تصور بات ہے، یا کم از کم یہ کہ ایک نادیدنی صورتِ حال ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ منکر سے رکنا ہی نہیں بلکہ روکنا بھی ایمان کا لازمہ ہے، [التوبۃ رکوع: ۱۰] اور اس کے مٹا دینے کے جذبۂ بے قرار سے خالی ہو جانا مرگِ ایمان کی نشانی [مسلم] اور اس کی طرف بلانا منافقین کا خاصہ ہے [التوبہ رکوع: ۱۰]۔ اور اس "منکر" کی تعریف ہمارے علمانے یہ کی ہے کہ "ہر وہ چیز منکر ہے جس کو شرع رد کر دے، یا عقلِ سلیم ٹھکرا دے[1]" تو شرع ان سیاسی، معاشرتی، انتظامی، عدالتی اصول و ضوابط کو رد نہیں کرتی جو کسی بھی نظامِ جاہلیت میں بر سرِ پیکار ہوتے ہیں؟ اگر کسی کا ذہن صرف قتل، زنا، چوری اور جھوٹ جیسے امور ہی کو منکر محسوس کرتا ہے تو اس کی بات ہی اور ہے۔ مگر جو شخص منکر سے مراد وہ لیتا ہے جو واقعتاً ہے، وہ تو ان باتوں کو منکر ہی نہیں منکرِ مبین سمجھنے پر مجبور ہو گا اور اگر وہ کسی سودی معاملے میں گواہ بننے سے سو بار اللہ کی پناہ مانگے گا تو یقین فرمایئے کہ ایسے منکرات کے اجرا و استحکام میں ساز گاری کرنے سے ہزار بار پناہ چاہے گا۔

[1] المنکر ما ینکر بہا [منکر ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو شرع یا عقل کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ (مفردات راغب اصفہانی)]

تعاون کے مختلف مراتب

لیکن جو شخص یا گروہ ایسے نظام کے پنجوں میں جکڑا ہوا ہو وہ اس سے یکسر بے تعلق تو ہو نہیں سکتا۔ پھر ایسی حالت میں واقعی اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں، اور اس کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ ایک زبردست سوال ہے جس کا صحیح حل ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ تلاش کرنا ہے۔

اس نظام کے ساتھ اس کا تعلق دو طرح کا ہو سکتا ہے ایک تو اختیاری دوسرا غیر اختیاری، ظاہر ہے کہ جس تمدنی اور انتظامی تعلقات کے رکھنے پر وہ بالکل مجبور ہے، اور اپنی خواہش اور پسند کے علی الرغم مجبور ہے، ان کے سلسلے میں اس پر کوئی دارو گیر نہیں۔ البتہ تعلق کی پہلی نوعیت ضرور قابل غور ہے اور ہمیں دراصل اسی تعلق کے بارے میں شرع شریف کا نقطۂ نگاہ معلوم کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس اختیاری تعلق کی مختلف صورتیں جان لینی چاہییں، کیونکہ جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ اس سراپا جاہلیت (نظامِ غیر اسلامی) سے تعاون (اختیاری تعلق) کی شکلیں کیا کیا ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا درجہ کیا ہے، اس وقت تک صحیح نتیجے پر پہنچنا بسا دشوار ہے۔

جہاں تک اصولِ تقسیم کا تعلق ہے، ہم اختیاری تعلق یعنی فعلِ تعاون کی دو موٹی قسمیں قرار دے سکتے ہیں۔ ایک اساسی دوسری فروعی۔ اساسی سے مراد یہ ہے کہ اس نظام کے قیام وبقا میں براہِ راست شرکت کی جائے، جسے آپ اس نظام کی پیشوائی اور علم برداری کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم میں نظامِ حکومت کی دو بنیادی باتیں شامل ہیں، دستوریہ کی شرکت اور مقننہ کی رکنیت۔ فروعی قسم میں اس نظام کی عام ملازمتیں شامل ہیں، جن کی حیثیت اس نظام کے پیکر میں اعضاو جوارح کی ہے، جب کہ قسمِ اساسی کی مثال اعضائے رئیسہ اور قوائے مدرِکہ کی سی ہے۔

پھر اس قسمِ فروعی کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ملازمتیں جن کے فرائضِ منصبی بجائے خود معصیت ہیں، اور ان میں ایسے امور سرانجام دینے پڑتے ہیں جو براہِ راست شرع کے خلاف ہیں۔ مثلاً محکمۂ آبکاری کی ملازمتیں، سودی اداروں (بینکنگ وغیرہ) کی ملازمتیں، ججی اور منصفی جیسی ملازمتیں، قتال فی غیر سبیل اللہ کی ملازمتیں وغیرہ۔ دوسری قسم ان ملازمتوں کی ہے جو بجائے خود تو معصوم معلوم ہوتی ہیں اور بظاہر اِن میں کوئی امرِ منکر انجام دینا نہیں پڑتا، لیکن چونکہ وہ ایک غیر اسلامی نظام کا جزو ہیں اور ان سے جاہلیت کے وسیع کاروبار میں اعانت ہوتی ہے، اس لیے

وہ گناہ کا کام بن جاتی ہیں۔ گویا آپ ان کے بارے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ بالذات تو معصیت نہیں مگر بالغیر ضرور معصیت ہیں، مثلاً محکمۂ رسل و رسائل کی ملازمتیں، محکمۂ نقل و حرکت کی ملازمتیں، محکمۂ تعلیم کی ملازمتیں (بعض شرطوں کے ساتھ) محکمۂ صحت کی ملازمتیں وغیرہ۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اختیاری تعلق کی یہ تینوں اقسام تعاون علی الاثم کی حدود میں شامل تو ہیں، لیکن ان سب کا حکم یکساں نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک کارِنا کردنی ہونے کا سوال ہے یہ ناپاک داغ موجود تو سب ہی کی پیشانیوں پر ہے۔ مگر ان کے مدارج میں فرق بھی ایک مسلّم بات ہے۔ ہر داغ کی ناپاکی یکساں گھناؤنی قرار نہیں دی جاسکتی۔ ہم یہاں ان تینوں ہی اقسام کے ضمن میں علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہیں۔

ا. دستوریہ اور مقننہ کی شرکت

کسی نظامِ حکومت کی اساس، جس پر اس کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اس کا آئین ہے، یا پھر وہ قوانین، جو اس آئین کی بنیاد پر بنتے ہیں۔ اس لیے آئین سازی اور قانون سازی کے کاموں میں شرکت سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ اگر یہ آئین وہ نہیں جو کتاب و سنت میں مسطور ہے، بلکہ اس کے خدوخال بالکل ہی جداگانہ ہیں، اور وہ ان اساسات اور اقدار کو مانتا ہی نہیں جو اسلام کی فراہم کردہ ہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس آئین و قانون سے اعلان بے زاری ایمان باللہ کے ابتدائی تقاضوں میں داخل ہے، اور اس کی کونسلوں میں بیٹھنا دراصل بنائے اسلام پر تیشہ چلانا ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ پر اٹھتی ہے۔ اب اگر ایک ایسا دستور بن رہا ہو جس کی پہلی اینٹ، انسانی اقتدار اعلیٰ اور جمہور کی حاکمیت پر رکھی گئی ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ پہلے ہی قدم پر اللہ تعالیٰ سے اعلانِ بغاوت ہو گیا، جس کے بعد کسی مسلمان کا اس دستور کی تدوین و تنفیذ میں ہاتھ بٹانا اللہ جلّ مجدہٗ کے ناقابلِ منازعت حقوق میں گستاخانہ مداخلت ہے، ایسی مداخلت جو ملحدوں، منکروں اور مشرکوں ہی کو زیب دیتی ہے، اور جو سب سے بڑا ''تعاون علی الاثم والعدوان'' ہے۔ اب آئندہ اس کے جو قدم بھی اٹھیں گے عملاً اسی عفریتِ جاہلیت کی خوشنودیِٔ خاطر میں اٹھیں گے، خواہ زبان اس کے خلاف ہی وقفِ گویائی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ مسلم ہونے کی حیثیت سے وہ اس نظام کی بیخ کنی پر مامور ہے، اور اس سرچشمۂ منکرات کے خلاف پیہم سعی وجہد اس کا

فرض لازم ہے۔ لیکن کوئی بتائے کہ اس انسان کے دل میں کسی نظام جاہلیت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے بھلا کیا انقباض محسوس ہو گا جو خود اپنے خونِ جگر سے سینچ کر زمین کو نم کرتا ہے تا کہ اس میں اس کی تخم ریزی ہو سکے، اور پھر اس پر برابر اپنی جان چھڑکتا رہتا ہے تا کہ یہ شجرِ خبیث اچھی طرح پروان چڑھ سکے، پھولے پھلے اور اس قابل ہو جائے کہ پوری انسانی زندگی کو اپنے سائے میں لے لے۔ منطق کی دنیا شاید اس اعجاز کو تسلیم کر لے مگر عمل کی دنیا تو اس کا یقین نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے طرزِ عمل کو، جو اپنی صوابدید اور خواہش کے مطابق معاملات کا فیصلہ کیا کرتے ہیں، کفر، ظلم اور فسق سے تعبیر فرمایا:

وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ[1] ...... الظّٰلِمُوۡنَ ...... الۡفٰسِقُوۡنَ (سورۃ المائدۃ: ۴۴، ۴۵، ۴۷)

”جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر...... ظالم...... فاسق ہیں۔“

[1] اس آیت کے بارے میں عجیب و غریب نکتہ آفرینیاں کی جا رہی ہیں اور یہ فرما کر کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی، گویا کوئی بہت قیمتی انکشاف کیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہی متفق علیہ نہیں ہے کہ یہ خاص طور پر یہودیوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن مان لیجیے کہ باعتبارِ شان نزول یہ آیت یہودیوں ہی کے حق میں خاص ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا پڑ جاتا ہے؟ کیا اس فقرے میں وضو اور طہارت کا کوئی جزوی مسئلہ بیان کیا گیا ہے، جس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ شریعت موسوی ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ اور اب چونکہ وہ شریعت منسوخ ہو چکی ہے اس لیے اہل قرآن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں؟ یا پھر حقیقت واقعہ اس کے برعکس ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل ضابطہ اور دین کا ایک محکم اصول بیان کیا گیا ہے، جو شریعتوں کے بدل جانے سے خود بھی نہیں بدل جاتا؟ تعجب ہے کہ اتنی بدیہی بات کو نہیں سمجھا جاتا اور اس طرح گویا ظاہر کیا جاتا ہے کہ ”معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کے ضوابطِ عدل و مکافات بھی تغیر پذیر ہیں، بعض قوموں کے ساتھ اس کا قانون جزا و سزا کچھ اور ہے اور بعض قوموں کے ساتھ کچھ اور، ایک ہی کام گر یہودی کرے تو قابلِ گردن زدنی اور وہی کام اسی نوعیت سے اگر مسلمان کرے تو قابلِ درگزر۔ جو حضرات آیتِ مذکورہ کی وعیدوں کو یہودیوں کا 'حق محفوظ' قرار دے کر خود مطمئن ہو جانا چاہتے ہیں، جب بزعم خود حضرت یوسف علیہ السلام کو فرعونِ مصر کی حکومت میں کام کرتے دیکھتے ہیں تو اس اسوۂ حسنہ کو دوڑ کر اس طرح اپنا لیتے ہیں گویا قرآن کا سب سے اول اور آخر حکم یہی ہے۔ کیا اس موقع پر یہ یاد نہیں پڑتا کہ یہ رویہ تو ایک ایسی شریعت میں اختیار کیا گیا تھا جو منسوخ ہو چکی ہے۔“

جب غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا ظلم اور فسق اور کفر کا کام ہے تو اندازہ فرمالیجیے کہ قوانین الٰہی کے مقابلے میں آئین و قانون بنانے والا کس زمرے میں شمار ہو گا؟ ایسے ہی لوگ تو ہیں جن کو طاغوت کا لقب دیا گیا ہے۔ جہاں یہ فرمایا گیا کہ:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَا كَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (سورۃ النساء:٦٠)

"یہ منافق چاہتے ہیں کہ اپنا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔"

کھلی بات ہے کہ اس طاغوت سے مراد ابلیس نہیں ہے[1]، بلکہ وہ یہودی سردار ہے [بالخصوص کعب بن اشرف یا ابو برزی اسلمی کاہن (تفسیر روح المعانی)] جو خود ساختہ اصولوں پر لوگوں کے مقدمے طے کیا کرتے تھے، درآں حالیکہ اللہ کا قانون ان کی بغل میں موجود تھا۔ اسی طرح ایک اور جگہ ایسے قوانین کو، جو خلافِ شرع ہوں، قوانینِ جاہلیت فرمایا گیا:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (سورۃ المائدۃ:٥٠)

"کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔"

اب جو لوگ اس ضابطۂ جاہلیت کے خالق ہوں ان کی پوزیشن پر غور کر لیجیے۔ ظاہر ہے کہ جب یہی آئین سازی اور قانون سازی پورے نظامِ جاہلیت کی جڑ ہے تو اس کام میں شرکت کرنے والا تعاون علی الاثم کی سب سے بڑی صورت اختیار کرنے والا ہو گا اور اس کی حیثیت دیگر معاونینِ جاہلیت کے مقابلے میں ہادی، رہنما اور سربراہِ کار کی ہو گی۔ پھر اس کا جرم بھی لازماً اسی تناسب سے زیادہ خوفناک ہو گا۔ افک کے واقعے میں آلودہ تو بہت لوگ تھے' مگر آخری سزا

[1] چنانچہ طاغوت کا مطلب علمائے ادب نے یہ بیان کیا ہے،الطاغوت عبارة عن كل معتد و كل معبود من دون الله۔ ولما تقدم سمى الساحر والكاهن والمارد من الجن والصارف عن طريق الخير طاغوتاً (طاغوت سے مراد وہ ذات ہے جو اپنی حدِ جائز سے تجاوز کر جائے اور ہر چھوٹا معبود بھی طاغوت ہے۔ اسی بنیادی معنٰی کے باعث، جس کا ذکر ہوا، ساحر، کاہن، شریر جن اور راہِ حق سے روکنے والے انسان سب طاغوت کہلاتے ہیں)(مفرداتِ راغب)

اور ”عذاب عظیم“ کی سزا صرف اس بدبخت کے حصے میں آئی جو اس افک کا مصنف اور اس ہنگامے کا لیڈر تھا، چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ:

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (سورۃ النور: ۱۱)

”ان میں سے ہر ایک نے جس مقدار کا گناہ کمایا ہے وہ اس کی سزا پائے گا، اور ان میں سے جو اس (واقعہ ہائلہ) کا سر دھرا ہے اس کو بڑی سزا ملے گی۔“

خلافِ شرع قانون سازی کی یہی جوہری نجاست ہے جس کے باعث علمائے دین نے اس کو معصیتِ فاحشہ قرار دیا ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی مرحوم سے پوچھا گیا کہ ”کچھ لوگوں نے جو سرکارِ انگریزی میں باعزت و باوقار ہیں (مطلب یہ ہے کہ اس کی مجلس قانون ساز میں نامزد کیے گئے ہیں) اور انہوں نے قانون خلافِ شرع کے بنایا ہے، ایسے قانون کو قبول کرنا اہل اسلام کو درست ہے یا نہیں؟ اور وہ لوگ بسبب اس قانون بنانے کے کافر ہو گئے یا نہیں؟“۔ آپ نے جواب دیا:

”ھو المصوّب۔ حق جلّ شانہ کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے ” وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ “ پس ایسا قانون، جو خلافِ شرع ہو، قبول کرنا اس کا اہل اسلام پر حرام ہے، اور جو اس کے موافق عمل کرے، گناہ اس کا مقننِ قانون کی گردن پر ہو گا...... اور ایجاد کرنے والے نے اگر قانونِ شرعی کو برا سمجھا اور اس کے ساتھ راضی ہو، اور اس کو خلافِ مصلحت وغیرہ کافی تصور کیا تو وہ کافر ہو گئے...... اور اگر انہوں نے قانونِ شریعت کو برا نہ سمجھا تو اگرچہ کافر نہیں ہوئے مگر بہت بڑے فاسق ہوئے۔“

(فتاویٰ جلد دوم، مطبوعہ مطبع یوسفی، صفحہ ۴۸، ۴۹)

اسی طرح ابھی پچھلے دنوں جب ہندوستان میں طاغوتِ برطانیہ دادِ فرماں روائی دے رہا تھا تو ایک خاص موقع پر پانچ سو علمائے امت کے دستخطوں سے یہ فتویٰ صادر ہوا تھا کہ کونسلوں میں شرکت حرام ہے۔ اور اس کی جو وجوہ بتائی گئی تھیں ان میں دیگر عارضی اور وقتی وجوہ کے ایک بنیادی اور مستقل وجہ یہ بھی تھی کہ:

> ''کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں[1]، جن کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرتِ مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من رای منکم منکراً فلیغیره بیده وان لم یستطع فبلسانه وان لم یستطع فبقلبه، مگر مسلم ممبرانِ کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شواہد واقعاتِ ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے۔''

دنیائے افتا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی فتویٰ اتنے اہتمام سے شائع ہوا ہو جس پر پانچ سو علمائے دین کی مہرِ توثیق ثبت ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ تھا بھی کچھ اسی شان و اہمیت کا، اس لیے کہ دین سے ناواقف اور مغرب زدہ مسلمانوں کا ایک گروہ طاغوتی پارلیمانوں کی شرکت میں کوئی قباحت سمجھتا ہی نہ تھا۔ اور ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ایک معمولی گناہ بھی اس وقت گناہِ کبیرہ بلکہ گناہِ اکبر بن جاتا ہے جب لوگ اس کے گناہِ عظیم ہونے کے تصور سے بے گانہ ہو جائیں، یا ہوتے جا رہے ہوں، چہ جائیکہ خلافِ شرع قانون سازی کا سا گناہِ عظیم! نظامِ جاہلیت سے تعاون کی اور شکلیں بھی ہیں۔ ان سب کے مقابلے میں اس خاص شکل کی سب سے زیادہ اہمیت اس لیے ہے کہ اس کا تعلق انسان کے عقائد و نظریات سے ہے، نہ کہ محض عمل سے، اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اعتقادی بے راہ روی عملی خامیوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

---

[1] یہی وجہ ہے کہ محدث دہلویؒ نے اس ملک کو بھی دارالحرب فرمایا ہے جس میں اگرچہ شعائرِ اسلام جاری ہوں مگر ان کے نفاذ کی بنیاد اس کا اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو بلکہ حکام کی بے تعصبی ہو۔ (فتاویٰ عزیزیہ، حصہ اول)

۲. نظامِ جاہلی کی خاص ملازمتیں

نظامِ جاہلی سے تعاون کی دوسری قسم بھی اپنے معصیت اور حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں رکھتی۔ جو کام بجائے خود گناہ ہو اس کو ایک نظامِ باطل کی چاکری اور خدمت گزاری کا ''شرف'' بھی اگر میسر آجائے تو وہ تو دوآتشہ بن جائے گا، اور اگر ابھی تک اس کا شمار منکرات میں تھا تو اب فحشا کی فہرست میں جا داخل ہو گا۔ یعنی اکہری معصیت دوہری بن جائے گی۔ ذرا غور تو فرمایئے! ایک شخص ایک ساہوکار کی دکان پر بیٹھا منیمی[1] کر رہا ہے اور اس کے سودی کاروبار کا حساب کتاب اور اس کی دستاویزات لکھتا ہے تو شریعتِ محمدی اس کو ملعون قرار دیتی ہے۔ اب اگر وہی شخص ایک جاہلی نظامِ حکومت کا کارکن بن جاتا ہے اور بینک کا ملازم بن کر سودی لین دین کرتا ہے، دوسری طرف اس نظام جاہلیت کے اجرا و استحکام میں معاون بھی بنتا ہے، تو کیا اب بھی اس کی ملعونیت اسی درجے کی رہے گی جس درجے کی ساہوکار کی دکان پر تھی؟ کون ہے جو اس کی اس ''ترقیٔ درجات'' کا انکار کر سکے؟ اسی ایک مثال پر اس طرح کی باقی ملازمتوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ اگر شراب کا غریب قلی تک اللہ رب العالمین کی نگاہوں میں مبغوض ہے تو محکمۂ آبکاری کا ملازم کیوں مبغوض تر نہ ہو گا، جب کہ وہ ساتھ ہی ایک سراپا جاہلیت نظامِ حکومت کی جڑیں بھی مضبوط کر رہا ہو؟ اگر قوانین الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا کفر اور فسق اور ظلم سے رشتہ جوڑ بیٹھتا ہے تو طاغوتی عدالتوں میں بیٹھ کر اپنے فیصلے نافذ کرنے والا اسلام سے محبت کا کیونکر دعویٰ کر سکتا ہے، جب کہ وہ ایک سراسر باطل مشینری کا اہم پرزہ بھی بنا ہوا ہو؟ اگر لشکرِ اسلام کے ساتھ ہو کر لڑنے والا نام نہاد مجاہد جہنم رسید ہو جاتا ہے، محض اس لیے کہ اس کے سامنے کلمۂ حق کی سربلندی نہیں بلکہ قوم کی سربلندی تھی تو اس جنگ باز کے لیے کس جنت کے دروازے کھل جائیں گے جو کلمۂ حق کی سربلندی کے بجائے قومی سربلندی ہی کے لیے نہیں لڑتا بلکہ ایک طاغوتی اقتدار کا بول بالا کرنے کے لیے لڑتا ہے؟ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی نظامِ باطل کے ساتھ ایسے تعاون کو جائز نہیں سمجھ سکتا۔ اس سلسلے میں اگر آپ فقہا و علمائے امت کے فتووں کی تائید بھی ضروری سمجھتے ہیں تو حسبِ ذیل فتووں پر نظر ڈالیے۔

---

[1] مُنیمی یعنی حساب کتاب۔ (مدیر ادارہ 'نوائے غزوۂ ہند')

الف. قتال فی غیر سبیل اللہ کے بارے میں شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"اگر کافر بادشاہ پر کسی دوسرے کافر بادشاہ نے حملہ کیا ہو تو ایسی صورت میں مسلم رعایا کا اپنے کافر بادشاہ کی طرف سے قتال کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے شر و کفر کی شوکت و عظمت ہو گی جس کی اعانت حرام ہے۔"

(کتاب المبسوط، شمس الدین السرخسی، الجزء المعاشر، باب نکاح اہل الحرب و دخول التجار الیہم بامان، ص ۹۷، ۹۸ مصر ۱۳۲۴ ء)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ بھی اس کی تصریح میں لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم کے زیرِ عَلم جنگ کرے، اگرچہ وہ جنگ خود اعدائے دین ہی سے کیوں نہ ہو رہی ہو اور اس ارشاد نبوی کا کہ "انا بریٔ من كل مسلم مع مشرك" اسی صورتحال سے تعلق جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں ہر اس مسلم سے بری ہوں جو کسی مشرک کے ساتھ ہو، یعنی جب وہ مسلم مشرکوں کے جھنڈے تلے لڑ رہا ہو۔"

(حوالہ سابق، کتاب السیّر ص ۲۴)

ب. حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ موالات کفار کے بارے میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"رہا سوال بمعنیٰ معاونت کا مسئلہ تو اس کا حکم ایک متعین ضابطے پر مبنی ہے، اور وہ یہ کہ کفر و معصیت کے کاموں میں اعانت بالاتفاق بجائے خود ایک معصیت ہے، کیونکہ ارشاد باری ہے وَلَا تَعَاوَنُوا ......الخ (گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو) یہ معاونت کبھی بامعاوضہ ہوتی ہے، جسے عرف عام میں نوکری کہتے ہیں، اور کبھی بے معاوضہ ہوتی ہے جسے مدد اور کمک کہا جاتا ہے، ان دونوں قسموں کا شرعی حکم ایک ہی ہے۔ یعنی اگر کفار کسی مسلمان سے جنگ کرنے جا رہے ہوں، یا اہل اسلام کے ہاتھوں سے کوئی ملک

چھین لینا چاہتے ہوں تو ایسی حالت میں ان کفار کی نوکری بھی حرام ہے اور مدد بے مزد بھی حرام ہے بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اگر کفار باہم خود برسر پیکار ہوں یا کسی ایسے ملک کا نظم و نسق چلانا اور اس کی مالیات جمع کرنا چاہتے ہوں جو پہلے ہی سے ان کا مقبوضہ چلا آرہا ہو اور اس سلسلے میں کسی مسلمان کو نوکر رکھ لیں تو جہاں تک ظاہرِ شرع کا تعلق ہے یہ نوکری مباح ہے، جیسا کہ عام اجارات مثلاً خیاطت اور تجارت وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ اور ایسی ملازمتیں بھلا کیوں نہ مباح ہوں گی جب کہ اکابر سلف کا مشرکین کی نوکریاں کرنا ثابت ہے۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو نوکریاں بھی حرمت سے خالی نہ نکلیں گی۔ بالخصوص اس زمانے میں کیونکہ کفار کی ملازمتیں، خصوصاً اس وقت جب کہ انہیں ملت کے سربر آوردہ لوگ اختیار کریں، کتنے ہی دینی مفاسد کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ سب سے چھوٹا مسئلہ جو ظہور میں آتا ہے یہ ہے کہ ان کافر اربابِ اقتدار کی بری حرکتوں پر ٹوک دینے میں مداہنت برتنے لگتا ہے اور ان کی پند و خیر خواہی کا حق ادا کرنے میں چشم پوشی اختیار کر جاتا ہے، ان کی جمعیت کا وزن بڑھاتا ہے، ان کی غیر معمولی عزت و تکریم کرنے لگتا ہے، ان کو آقا اور مالک اور قبلہ کہتا ہے، ان کی محبت کے گیت گانے لگتا ہے۔"

(فتاوی عزیزیہ، صفحہ ۱۴)

اس فتوے کو غور سے پڑھیے۔ حضرت شاہ صاحب کفار کی ان انفرادی ملازمتوں کو بھی، جن کی حیثیت کسی کا کپڑا اسلا دینے یا سودا خرید و فروخت کر دینے کی ہے، بظاہر مباح ٹھہرانے کے باوجود گہرے جائزے کے بعد "خالی از حرمت" نہیں بتاتے۔ پھر ان ملازمتوں کی ان کی نگاہ میں کیا حیثیت ہو گی جو شانِ انفرادیت نہیں رکھتیں بلکہ جن کے معنٰی یہ ہیں کہ خود اپنے اوپر اور دوسرے پیروانِ اسلام کے اوپر اس اثمِ اکبر اور اس منکرِ اعظم کی گرفت کو ڈھیلی نہ ہونے دیں جو نظامِ حکومت کے نام سے ان پر مسلط ہے، اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ ان میں لازماً ایسے امور انجام دینے پڑتے ہوں، جو بذاتِ خود منصوص طور پر، اور براہ راست حرام ہوں۔

ج. مولانا عبد الحی صاحبؒ فرنگی محلی ایک استفتا کے جواب میں فرماتے ہیں:

”جس نوکری میں پابندی اجرائے احکامِ غیر شرعیہ کی اور اجرائے احکام ظلم وغیرہ کی نہ ہو وہ درست ہے اور جن میں یہ امور ہوں وہ حرام ہیں۔“

(جلد دوم ص ۱۶۲)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ دورِ حاضر کے علما میں سے بعض بزرگوں کی رائیں سن لیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے افکار و خیالات کے سب سے بڑے اور معتمد شارح مولانا عبد الباری ندویؒ مسئلۂ زیر بحث کے بارے میں مولانا کا یہ فتویٰ نقل فرماتے ہیں:

”البتہ (حکومتِ کافرہ کی) نوکریوں میں کم از کم اتنی احتیاط کی ہدایت ہے کہ اگر کوئی اور صورت معاش کی نہیں تو تعلیمات وغیرہ کی ویسی نوکریاں کرو جن میں عدالتی عہدوں وغیرہ کی طرح شریعت کے احکام کی صراحتاً مخالفت نہ کرنا پڑے۔ اس طرح اگر دیکھتے ہو کہ کوئی ایسا مالی و جانی مقصد یا ناقابل تحمل ضرر پہنچ رہا ہے جس کے رفع کے لیے عدالتی چارہ جوئی سے چارہ نہیں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ فقہا نے ایسی صورتوں میں رفعِ ظلم اور حصولِ حق کے لیے رشوت تک کی اجازت دی ہے۔“

(ماہنامہ معارف، جنوری ۱۹۴۷ء جلد ۹ شمارہ ۱، ص ۴۷،۴۸)

اسی طرح ایک بار حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے ایک نائب تحصیل دار نے رجوع کیا اور ان سے اپنی ملازمت کے بارے میں اپنے اس قصد کا اظہار کرتے ہوئے فتویٰ پوچھا کہ سرکارِ انگریزی کی اس ملازمت کو ناجائز سمجھ کر چھوڑ دینا چاہتا ہوں، تو مولانا نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"میں جہاں تک سمجھا ہوں، آپ کو جب کہ دوسرا طریقۂ اکلِ حلال میسر ہے تو آپ کو اس ملازمت کو چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ اگرچہ وہ اہم 'استفتا[1]' میری نظر سے نہیں گزرا، مگر جو مضمون اس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اقرب الی الصواب ہے۔ آپ کے احباب کا حکم میری[2] سمجھ میں نہیں آتا اگرچہ وہ علما ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر اسلامی حکومت کی نوکری فی نفسہٖ ناجائز نہیں تو اسے چھوڑ دینے کا فتویٰ بھی نہیں دیا جاسکتا۔ پس مولانا (مدنی) کا یہ فرمانا کہ "اس ملازمت کو چھوڑ دینا چاہیے" مطلب یہ رکھتا ہے کہ یہ ملازمت ان کے نزدیک جائز نہیں۔

علمائے حال و ماضی کی ان واضح تصریحات پر غور کیجیے۔ اگرچہ یہ فتوے مختلف ملازمتوں سے متعلق ہیں لیکن اصل وجہِ حرمت ان سب میں مشترک ہے، اور وہ یہ کہ ان میں احکامِ غیر شرعیہ پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ ویسے ان فتووں میں مسئلۂ زیر بحث کے قریب قریب سارے ہی پہلوؤں پر الگ الگ روشنی پڑ گئی ہے۔ اس لیے اگر آپ ان ساری تصریحات کو یکجا کر کے دیکھیں تو مسئلہ پوری طرح منقح ہو جاتا ہے، اور نظامِ جاہلیت کی ایسی ملازمتوں کے حرام ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا۔ جن میں محرمات شرعیہ کی بجا آوری بھی کرنی پڑتی ہے۔

۳. عام ملازمتیں

تعاون علی الاثم کا سب سے آخری اور معمولی درجہ ان ملازمتوں کا ہے، جو مذکورہ بالا خاص ملازمتوں کے علاوہ ہوں، جن میں بجائے خود کوئی خلاف شرع کام نہ کرنا پڑتا ہو اور جن کی ناپاکی کا اس کے سوا کوئی اور باعث نہیں کہ وہ ایک سراسر فاسد نظامِ حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں فی نفسہٖ تو کوئی قباحت نہیں، مگر چونکہ وہ ایک جاہلی نظام کے کل پرزے کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے ان کو تعاون علی الاثم سے باہر نہیں قرار دیا جاسکتا، اور نہ دین کے مزاج

---

[1] اس اہم استفتا سے مراد مولانا مودودیؒ صاحب کا مشہور پمفلٹ "ایک اہم استفتا" ہے جس کے مضمون کا حوالہ دے کر فتویٰ پوچھا گیا تھا۔

[2] حکم ان احباب کا، جن میں علما و مشائخ بھی شامل تھے، یہ تھا کہ آپ اس ملازمت کو ہرگز نہ چھوڑیں، مسلمانوں کی ملی مصلحت کا مفاد اسی میں ہے۔

شناسوں نے انہیں ایسا قرار دیا ہے۔ علامہ سرخسیؒ نے اپنے مذکورہ بالا فتوے میں جو یہ فرمایا کہ "اس سے کفر و شرک کی عظمت و شوکت ہو گی، جس کی اعانت حرام ہے"، تو دراصل اسی ضابطۂ شرعی کا اعلان فرمایا۔ محدث دہلویؒ کے جملے اسی اصلِ اصیل کے ترجمان ہیں، حضرت تھانویؒ نے "تعلیمات وغیرہ" کی نوکریاں بھی اگر "کوئی اور صورت معاش کی نہ ہونے" کی شکل ہی میں مباح ٹھہرائیں تو ان کی نگاہ بھی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے تیور دیکھ رہی تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ نظام طاغوتی کی یہ نوکریاں اگر تعاون علی الاثم نہیں ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تعاون علی الاثم ایک ایسا تصور ہے جس کی خارج میں کوئی عملی تعبیر نہیں۔ پس حیرت اس بات پر نہ ہو گی کہ ان بظاہر معصوم نوکریوں کو اس عارض کی بنا پر ناجائز کہہ دیا جائے، بلکہ حیرت اس امر پر ہو گی کہ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کی باترتیل و باتجوید قرأت کرتے رہنے کے باوجود اس کا کوئی محل نہ قرار دیا جائے، حتیٰ کہ نظامِ کفر کی گاڑی بانی بھی اس کی زد سے صاف نکل جائے۔

لیکن بااین ہمہ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ برائی کے معاملے میں یہ تعاون کی سب سے ہلکی شکل ہے اور اس کی شناعت دوسری دونوں قسموں کے مقابلے میں کم اور بہت کم سزاوارِ نکیر ہے۔

رخصتِ اضطرار

جہاں تک نفسِ مسئلۂ تعاون کا تعلق ہے، اس کا علمی تجزیہ اور الگ الگ ہر صورتِ حال کے لیے حکمِ شریعت تو یہی ہے، اور اصلاً کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ نظامِ جاہلیت کے ساتھ تعاون کی ادنیٰ صورت بھی اختیار کرے کیونکہ اس نظام کے ساتھ کسی قسم کی سازگاری کرنا اس کو قائم رکھنے اور پائیداری بخشنے کے ہم معنٰی ہے اور شریعت کے اصول اور محکم ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ جاہلیت اور اس کے لوازم کے ساتھ سازگاری نہ کرو، اور بقول علامہ سرخسیؒ، شرک و کفر کی اعانت حرام ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ شریعت کا ایک اصولی ضابطہ یہ بھی ہے کہ مجبور کُن حالات میں حرام کا اختیار کرنا مباح ہو جاتا ہے، (فمن اضطر الخ)۔ جس قسم کے مسلمانوں کا معاملہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، وہ یقیناً ایسے حالات سے بالکلیہ آزاد نہیں کہے جاسکتے جن میں جبر کا پہلو موجود ہو۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جہاں کہیں بھی جبر و اضطرار کے حالات واقعی رونما ہوں وہاں حرمت کی ان بندشوں کو ڈھیلا نہ

سمجھا جائے۔ نظری بحث کی حد تک تو اس بات کے برحق اور متفق علیہ ہونے میں کوئی کلام نہیں، مگر اس ضابطے کا عملی انطباق ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ ہے، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ ایمان کی خودی ہچکیاں لے رہی ہو اور پست خیالی، دوں ہمتی اور سہل انگاری لوگوں کا وطیرہ بنتی جا رہی ہو۔ نفس انسانی بالطبع سہل پسند واقع ہوا ہے، وہ اپنے لیے رعایتوں کے ڈھیر سمیٹ لینا چاہتا ہے اور اگر ان رعایتوں اور رخصتوں کا تعین خود اسی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے جھولے میں جو کچھ بھی نہ بھر لے تھوڑا ہی ہے۔ اس لیے بڑی دیدہ دری کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ آیئے دیکھیں کہ کسی غیر اسلامی اسٹیٹ کے محکوم مسلمانوں کو واقعی کیا مجبوریاں پیش آسکتی ہیں اور ان مجبوریوں کے نتیجے میں وہ مجبور ہو کر اس کے ساتھ تعاون کی، جو اصلاً بہر حال تعاون علی الاثم ہی ہے، مختلف صورتوں میں سے کن صورتوں کو اختیار کر سکتے ہیں اور کن احساسات کے ساتھ؟

اضطرار کی واقعی صورتیں

نظامِ جاہلیت سے اس تعاون کے لیے واقعی مجبوریاں دو ہی قسم کی ہو سکتی ہیں:

ایک تو یہ کہ محکوم مسلمانوں کو کونسلوں کی شرکت اور سرکاری ملازمت پر حکومت کی طرف سے مجبور کیا جائے۔

دوسری یہ کہ کسی مسلمان کو معاشی تنگ حالیاں گھیرے ہوئے ہیں اور وہ اپنے کم سے کم کفاف کے لیے نظام جاہلی کی خدمات کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ پاتا ہو۔

ا۔ حکومت کا جبر

جہاں تک پہلی صورتِ اضطرار کا تعلق ہے، اس کا پایا جانا بسا دشوار ہے۔ تاہم بالفرض اگر کہیں یہ عجیب و غریب صورتِ اضطرار موجود ہی ہو تو کونسلوں میں شریک ہو جانے اور کتاب و سنت سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کرنے میں بھی آدمی معذور ہے، چہ جائیکہ تعاون کی کوئی اور شکل، کہ وہ بہر حال اس سے فروتر ہی ہو گی کیونکہ جب خوف جان سے وقتی طور پر صریح کلمۂ کفر کہہ دینے تک کی رخصت موجود ہے (من اُکرہ الخ) تو نسبتاً ہلکے گناہوں کے ارتکاب کی رخصت کیوں نہ ہو گی؟

۲. معاشی مجبوری

رہ گئی دوسری صورتِ اضطرار تو اس کے وجود کا ہمہ وقت امکان ہے، اور ناگزیر ضروریاتِ زندگی کا مسئلہ بھی اگر اس تعاون کے بغیر حل ہوتا نظر نہ آئے تو یقیناً ایک شخص کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ نظامِ کفر کی چاکری قبول کرلے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی دو اصولی باتوں کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے:

۱. یہ کوئی اجتماعی پالیسی کی بات نہیں، بلکہ اس کی حیثیت بالکل انفرادی ہے۔ یعنی مضطر قوم نہیں، افراد ہوتے ہیں، اور ایسی معاشی مجبوریاں کہ نظامِ جاہلی کی نوکریاں کیے بغیر جسم و جان کا رشتہ بر قرار رکھنا دوبھر ہو جائے[1]، پوری قوم کو نہیں بلکہ صرف افراد کو پیش آسکتی ہیں، اس لیے وہ پوری قوم کی معاشی پالیسی کی بنیاد نہیں ہو سکتیں۔ قوم کی اجتماعی پالیسی تو اس کے خلاف ہوگی، اور اس کا عمومی مزاج اس کو برابر نظروں سے گرانے کی کوشش کرے گا، کہ بہر نوع یہ اصلاً ہے ایک کارِ منکر ہی، اور اگر کسی مجبوری کی بنا پر وہ کسی فرد کے حق میں مباح ہو گیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ اسے غنیمتِ باردہ سمجھ بیٹھے، اور دوسرے اہلِ ملت بھی اس "کامیابی" پر اس کی تحسین و آفریں کریں۔ یقیناً اس فرد کو سزاوارِ ملامت تو کوئی نہیں قرار دے سکتا، مگر اس کی اس حالت کو پسند کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔ لیکن اگر بد قسمتی سے قوم کا اجتماعی ضمیر اس صورت کو گوارا کرنے لگا اور اس طرح نظامِ باطل کی جلوداری کر کر کے مسلمانوں کی معاشی فلاح و ترقی کو قومی پالیسی ٹھہرالیا گیا تو اس کا صرف ایک ہی نتیجہ بر آمد ہوگا اور وہ یہ کہ پوری قوم انہی معاشی مجبوریوں اور مصلحتوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے گی، اور جس شجرِ خبیث کی بیخ کنی اس کی زندگی کا فریضہ و مقصد تھا، اسی کی حفاظت اور آبیاری کی خدمتیں انجام دینے میں اس کی نسلوں پر نسلیں بیتتی چلی جائیں گی، یہاں تک کہ نظامِ اسلامی کا قیام اس کے لیے ایک لفظِ بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گا۔

۲. اس اضطرار کے بھی درجات ہیں، جو افرادِ قوم بھی اپنی معاشی مشکلات کے حل کے لیے بادلِ ناخواستہ کسی نظامِ جاہلی کی خدمت گزاری پر مجبور ہوں انہیں اس خدمت کی مختلف قسموں میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ مجبوری کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ انہیں اس نظام سے ہم رشتہ ہو جانے میں بالکل چھوٹ ہے، اور جس نوعیت کے رشتے کو چاہیں، یکساں

---

[1] جس طرح بحالتِ مجبوری خنزیر کھانا۔ ان نوکریوں کی حیثیت اس سے قطعی مختلف نہیں۔ (ناشر، ماہنامہ "زندگی" رام پور)

تصورِ اباحت کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں، اب انہیں قانون کے تحت جس طرح اس کی اجازت ہے کہ ریل، ڈاک، تار، حفظانِ صحت اور تعلیمات وغیرہ محکموں میں ملازمت کرلیں[1]، اسی طرح وہ اس کے بھی مجاز ہیں کہ بینکنگ، آب کاری، عدالت اور فوج جیسے محکموں میں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا سودا کرتے پھریں، یہاں تک کہ اگر اسمبلی کی ممبری کے بھتے اس مشکل کشائی کے لیے تیار ہوں تو بلا تکلف ان سے بھی استعانت کی جاسکتی ہے۔ بخلاف اس کے صحیح رویہ یہ ہوگا کہ اگر حصولِ معاش کے لیے نظام کفر کی چاکری کیے بغیر کوئی چارۂ کار نظر ہی نہ آئے، تو صرف دوسرے درجے کی نوکریاں ہی گوارا کی جائیں، جو بلاواسطہ نہیں بالواسطہ حرام ہیں، جو دوہری نہیں بلکہ صرف اکہری معصیت ہیں، تاکہ جہاں تک ممکن ہو اس نظام باطل کی اعانت و تقویت سے انسان بچ سکے، جس کو وہ اصولاً اور اعتقاداً غلط سمجھتا ہے، اور اس کو تعاون علی الاثم کے کھلے مظاہرے نہ کرنے پڑیں، کونسلوں میں بیٹھ کر اپنے اصولی عقائد کی خلاف ورزی نہ کرنی پڑے، قتال فی سبیل اللہ، عدالت، آبکاری اور بینکنگ جیسے محکموں میں جاکر بالواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی، یعنی دوہری قسم کی معصیت کا ارتکاب نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے حالتِ اضطرار کی رخصتوں کا جہاں ذکر فرمایا ہے، وہیں اصلاً حرام اشیا سے استفادہ کرنے کے لیے یہ شرط بھی عائد کردی ہے کہ انسان

---

[1] دراصل یہ ادارے کفر و شرک کی عظمت و شوکت کے ساتھ ساتھ آج اسے چلانے والے بنیادی اداروں کی حیثیت حاصل کرچکے ہیں۔ بلکہ طاغوتی نظام اپنے مکروہ چہرے پر پردہ ڈالنے کے لیے رفاہِ عامہ کے انہی اداروں کا حوالہ دے کر بندگانِ خدا پر اپنے تسلط کو دراز کرنے میں کامیاب ہوسکا ہے۔ جہاں تک ریل وڈاک تار کے محکموں کا معاملہ ہے تو یہ بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ انگریزوں نے ہند میں اپنی آمد کے بعد سب سے پہلے ان کی بناڈالی، جو ان کے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے ناگزیر تھا۔ آج بھی برسرِ اقتدار طاغوتی نظام ان سے ویسی ہی خدمت لے رہا ہے۔ اسی طرح بظاہر بے ضرر معلوم ہونے والے حفظانِ صحت اور تعلیم کے محکموں کا حال ہے جو آج کفر کا سب سے دھاردار ہتھیار بن چکے ہیں۔ باطل کی غیر شرعی اسکیموں کو متعارف کرانے اور اس کے لیے مختلف موقعوں پر رائے عامہ ہموار کرنے میں یہ ادارے بے حد اہم رول ادا کررہے ہیں۔ انتخابات کے بیلٹ پیپر بنانے سے انتخابات کرانے تک، فیملی پلاننگ سے نس بندی تک، سیکس ایجوکیشن سے ایڈز کے بارے میں اویرنیس پیدا کرنے تک (جس کا مقصد پورے معاشرے میں حیا و شرم کی بساط لپیٹ دینے کے سوا کچھ نہیں) نہ جانے کتنے امور انہی محکموں کے ذریعے انجام دیے جارہے ہیں۔ اور مسلم معاشرے کے لیے یہ انتہائی مہلک اس لیے بھی ہیں کہ جب ایک استاد یا ڈاکٹر جسے معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہ کام کرتا نظر آتا ہے تو اس کے اثرات غیر معمولی پڑتے ہیں۔ اس لیے باطل کے ہمہ گیر تعلق کے بعد شاید ہی کوئی محکمہ بے ضرر بچا ہے جیسا کم سے کم تیس سال پہلے بظاہر نظر بھی آتا تھا۔ (ناشر، ماہنامہ "زندگی" رام پور)

"حدِ ضرورت" سے آگے نہ بڑھے (فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ) "پھر جو کوئی پھنسا، نہ بے حکمی کرتا ہے نہ زیادتی، تو اسے نہیں گناہ، اللہ بخشنے والا ہے مہربان"۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۳) "حدِ ضرورت" میں جس طرح یہ بات شامل ہے کہ آدمی واقعی ضرورت سے زائد مقدار میں حرام استعمال نہ کرے، اسی طرح یہ بات بھی اس سے الگ نہیں کہ کم سے کم حرمت والی چیز ہی استعمال کرے، اور جس درجے کی حرام چیز، یا حرام ذریعے سے پیش آمدہ مشکل کا حل نکل آتا ہو، اس سے بڑے درجے کی حرمت والی شے یا ذریعے کو ہرگز ہاتھ نہ لگایا جائے۔ مشکوک یا مکروہ پانی کی موجودگی میں ناپاک پانی سے پیاس بجھانے کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، اور اگر ناپاک پانی موجود ہو تو شراب پی کر جان بچانے کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ مولانا تھانویؒ کے اس خیال کو پھر سے ذہن مین تازہ کر لیجیے کہ "اگر کوئی اور صورت معاش کی نہیں تو تعلیمات وغیرہ کی ایسی نوکریاں کرو جن میں عدالتی عہدوں کی طرح شریعت کے احکام کی صراحتاً مخالفت نہ کرنا پڑے"۔ اسی طرح (شاہ عبد العزیز) محدث دہلویؒ کے ان الفاظ پر بھی دوبارہ نظر ڈال لیجیے، جن کی ابتدا انہوں نے "عندالتّعمّق" (یعنی خوب گہرائی) سے کی ہے۔

معاشی مجبوریوں کی بنا پر نظامِ جاہلیت کی خدمت گزاری اسی وقت مباح ہوسکتی ہے، جب ان دونوں اصولوں کا پورا پورا لحاظ کر لیا جائے۔ اس کے بعد درجۂ دوم ہی کی نہیں درجۂ اول کی ملازمتیں بھی انگیز (برداشت) اور اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ عملی نقطۂ نگاہ سے صورتِ حال بہت شاذونادر ہی پیش آسکتی ہے کیونکہ اصولاً یہ ملازمتیں اسی وقت قبول کی جانی چاہییں جب درجۂ دوم کی اکہری معصیت والی ملازمتیں بھی نہ مل سکیں، اور تجربہ یہ کہتا ہے کہ ایسی ملازمتوں کا ملنا دوسری قسم کی ملازمتوں کے ملنے کے مقابلے میں دشوار تر ہے، اور ان کے لیے کافی صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہوں کہ وہ بینک کا نظام چلا سکیں، یا عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ سکیں، یا قانونی نقطہ بیان کر کے مقدمات میں بحث کر سکیں، وہ دوسری قسم کی نسبتاً معمولی ملازمتوں کے لیے زیادہ اہل قرار دیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ خود بھی انہیں پسند کریں، اور وہ ایسی ملازمتیں آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں، بشرطیکہ انہی پر وہ خود بھی قانع ہوں۔ علاوہ ازیں یہ ملازمتیں بالعموم ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے قصداً پہلے سے تیاری کرنی پڑتی ہے اور سالہا سال ان کے لیے ایک خاص قسم کی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے، تب کہیں جا کر انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اس نوکری کا نام لے سکے۔ ایسا ہوتا نہیں کہ آج کسی کو رزق کی مجبوری پیش آئی اور اس نے محسوس کیا کہ

اس طرح کی نوکری کے سوا اور کوئی ذریعہ میری مشکل کے حل کا نہیں، پھر وہ اٹھا اور سرکار کے حضور ملازمت کی پیش کش لے کر کھڑا ہو گیا اور اسے کرسی پیش کر دی گئی۔ اس لیے ازروئے واقعہ اس قسم کی ملازمتوں کا اضطراراً اختیار کیا جانا کچھ بہت دشوار سی بات ہے۔ ایسی ملازمتیں تو وہی پا سکتا ہے جو ایک مدت سے ان کے لیے فراغِ قلب کے ساتھ تیاری کر رہا ہو اور ان کی تمنا دل میں پال رہا ہوتا ہے۔ کیا ایسے آدمی کو واقعی مضطر کہا جا سکتا ہے؟

لیکن ہم شاذ و نادر حالات کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔ پس ایک آدھ آدمی اگر واقعی معنوں میں مضطر ہوں اور پورے اخلاص کے ساتھ محسوس کریں کہ اضطرار کی ساری شرائط وہ اپنے اندر رکھتے ہیں، تو یقیناً وہ یہ ناگوار قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ جتنا بڑا یہ گناہ ہے، اتنی ہی زیادہ شدید مجبوری کے عالم میں یہ قدم اٹھانا چاہیے، پھر اتنا ہی زیادہ اپنے دل میں ناگواری اور استکراہ کا سخت جذبہ موجود رکھنا چاہیے اور محسوس کرتے رہنا چاہیے کہ میں یہ کارِ ناکردنی کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے اور جلد سے جلد اس سے گلو خلاصی بخشے۔ نہ صرف یہ دعا کرے بلکہ اپنی پوری کوشش بھی صرف کرتا رہے اور ممکن عجلت کے ساتھ غلاظت کے اس متعفن لبادے کو اپنے اوپر سے اتار پھینکے۔

جہاں تک نظامِ کفر کے ساتھ تعاون کی پہلی قسم کا علم ہے، معاشی مجبوریوں کی بنا پر اس کے اختیار کرنے کی حالتِ اضطرار ہر گونہ خلافِ قیاس ہے۔ اس لیے کونسلوں کی رکنیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

حالتِ اضطرار کا محمل

رہی یہ بات کہ کوئی آدمی واقعی معنوں میں مضطر کب ہوتا اور کب رہتا ہے؟ یعنی وہ کیسے حالات میں بدی اور جاہلیت کے ساتھ اس جبری تعاون کے لیے تیار ہو، اور کیسے حالات تک یہ تعاون کرتا رہے؟ تو یہ بات کسی دوسرے سے زیادہ خود اپنے طے کرنے کی ہے۔ جتنا ہی زیادہ انسان کا احساسِ ایمانی بیدار ہو گا اتنا ہی زیادہ اس رخصت سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرے گا۔ کوئی دوسرا کسی کی واقعی مجبوریوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یوں اس مسئلے پر اگر گفتگو کی جائے تو بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لیے ہم یہاں صرف ایک صاحب علم بزرگ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم و مغفور کا نقطۂ نگاہ درج کرنے پر اکتفا کریں گے۔ مولانا عبد الباری ندوی صاحب مولانا مرحوم کے خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”بلکہ اگر اتفاق سے اگر کسی ایسی ملازمت میں مبتلا ہو، اور کم ہمتی سے اس کا اندیشہ ہو کہ اس کو ترک کرکے اور زیادہ مفاسد میں پڑ جاؤ گے، مثلاً معاشی تنگی کا تحمل نہیں، اس کی پریشانیوں میں پڑ کر اللہ سے شکوہ شکایت پیدا ہو، نماز روزے کے فرائض سے بد دل ہونے کا ڈر ہو (کاد الفقر ان یکون کفراً) تو ایسی صورت میں جب تک کوئی دوسرا ذریعہ پیدا نہ ہو، ایسی ملازمت کو معصیت سمجھتے اور استغفار کرتے رہو، ساتھ ہی اس کی پوری کوشش کرتے رہو کہ جلد از جلد اس سے نجات ہو، خواہ اس کی کوشش میں زندگی بھر کامیابی نہ ہو، مگر کوشش کا حق ادا ہو، محض کوشش ناکام نہ ہو۔“

حالتِ اضطرار کا ہمارے خیال میں یہ نرم سے نرم اور نیچا سے نیچا معیار ہے۔ غالباً مولانا نے ابنائے زمانہ کی پست ہمتوں کو دیکھ کر اتنی غیر معمولی رعایت فرمائی ہے۔ تاہم اصولاً ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے، اور ان کا یہ ارشاد نوٹ کر لینے کے قابل ہے کہ ”جب تک کوئی دوسرا ذریعہ پیدا نہ ہو، ایسی ملازمت کو معصیت سمجھتے رہو“۔

اضطرار کی غیر واقعی صورت

یہ ہے اضطرار کی واقعی صورت اور حالت، اور اس کی انتہائی وسعت۔ لیکن غلامی و محکومی صرف ایک برائی ہی نہیں ہے، بلکہ بے شمار برائیوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ جسموں کی غلامی پر جب طویل دور گزر جاتا ہے، تو غالب اقتدار رنگ رنگ کے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دماغوں پر حملہ آور ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ فکری غلامی کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ اس وقت ذہنیتیں منقلب ہو جاتی ہیں، نقطۂ ہائے نظر بدل جاتے ہیں، ضمیر کے احساسات فاسد ہو جاتے ہیں، اور خوب و ناخوب کا معیار یکسر الٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک قانون ہے، جس سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں۔ اس لیے کچھ بعید نہیں، اگر اضطرار کا محل بھی بدل لیا جائے اور مجبوری کی ایسی صورتیں بھی قرار دے لی جائیں، جو بالکل غیر فطری اور غیر واقعی ہوں، اور پھر نظامِ کفر سے تعاون کے سارے ہی دروازے چوپٹ کھول لیے جائیں۔ یہ صرف گمان ہی گمان نہیں، بلکہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔

قومی مفاد

اضطرار کی غیر واقعی صورتوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول صورت قومی مفاد کی پامالی ہے۔ محکوم قوم کا سب سے بڑا جرم یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس کو اپنی غیرت، اپنی دولت، اپنی ملی حشمت، اپنی تہذیب، اپنے دین، اپنے نظامِ زندگی سب کو مجروح دیکھنا ناگزیر ہے، اور اس ناگفتہ بہ صورتِ حال کا علاج ہے بڑا سخت، اور ذہنوں کا، بالخصوص غلام ذہنوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ آسان نسخے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ادھر وہ نظامِ قاہر جو ان پر مسلط ہوتا ہے، خود اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہوتا ہے، اور اس کے عوض ان کے سامنے کچھ قومی منافع پیش کرتا ہے۔ طلب اور جوابِ طلب کا یہ "قران السعدین" عجیب و غریب نتیجہ پیدا کر دیتا ہے اور محکوم اسی نظام حکومت کی بنیادوں کو مضبوط بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے، جو اس کے اپنے مقصدِ ملی کی ہڈیوں پر قائم ہوا ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی صورت حال ان مسلمانوں کو بھی پیش آجاتی ہے جو ایک مدتِ دراز سے محکومی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ رزق کے قریب قریب سارے ہی دروازوں پر حکومتِ حاضرہ سے عملی تعاون کی شرط آویزاں ہے، اس لیے اگر اپنے لیے دینی اصولوں کی جامد تقلید کی گئی تو قوم اقتصادی حیثیت سے تباہ ہو جائے گی۔ اور چونکہ قومی ترقی اسی اقتصادی استحکام پر موقوف ہے (حالانکہ قرآن نے اسے کسی اور ہی چیز پر موقوف قرار دیا تھا) اس لیے پوری قوم کو سرکاری ملازمتوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس طرح بلا امتیاز سارے ہی محکموں کی چاکری پوری قوم کی اجتماعی پالیسی بن جاتی ہے۔ خیر ابھی تک تو غنیمت ہے، اور اگر جوشِ تعاون کی یہ ریس حد پر جا کر رک جاتی تو کسی طرح صبر بھی کیا جا سکتا تھا، مگر وہ آگے بڑھتی ہے اور مفادِ قومی کی حفاظت کا جذبۂ بے اختیار مسلمان کو ان جگہوں کی طرف بھی سر کے بل دوڑا دیتا ہے، جہاں "شریعتیں" بنائی جاتی ہیں، جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حقوقِ قانون سازی رکھنے والے طواغیت اکھٹا ہوتے ہیں، اور جہاں ربّ العالمین کی حاکمیت کو اعلانیہ چیلنج دیا جاتا ہے، جس کو سن کر مومن کا احساسِ غیرت چیخ اٹھتا ہے ع

"اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں"

ظاہر ہے کہ نظامِ جاہلیت کے ساتھ تعاون کی یہ معراج ہے، اور ایک مومن کے بنیادی تصوراتِ ایمانی کے صریح خلاف۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے شعور کی حد تک انتہائی مخلص ہوتے ہیں، وہ قومی درد سے بے تاب ہوتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق اگر بچائے جاسکتے ہیں تو اسی طرح۔ اگر ہم اپنے سیاسی تصوراتِ زندگی کی قربانی اس وقت گوارا نہ کریں تو اغیار ہمارے زندگی کے دروبست پر بری طرح چھاجائیں گے اور آئے دن جو قوانین بنتے رہتے ہیں، ان میں ہمارے مفاد اور احساس کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے گا۔ یعنی یوں کہیے کہ یہ لوگ اپنے کو مجبور و مضطر سمجھتے ہیں، اور رخصت اضطرار کے ماتحت ہی کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں...... لیکن دراصل قانونِ اضطرار کی یہ نہایت غلط تطبیق اور رخصتِ اضطرار سے بالکل بے جا فائدہ اٹھانا ہے۔ جہاں تک اقتصادی استحکام کے لیے بلا امتیاز سارے ہی محکموں کی ملازمت کا تعلق ہے، یہ خالص مادہ پرستانہ اندازِ فکر ہے۔ ایسے حضرات کو یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمانوں کا عروج و استحکام ان کے اقتصادی استحکام میں نہیں، بلکہ ان کے اخلاقی اور دینی استحکام میں ہے۔ پھر بھلا وہ مسلمان کیا ترقی کریں گے جو اپنی مزعومہ معاشی فلاح کے لیے اپنے اخلاقیات اور اپنے اصولِ دین کو ٹھوکریں مار دیں۔

رہ گئے وہ لوگ جو قومی مفاد کے ڈر سے مجبور ہو کر کونسلوں کی شرکت تک کو ضروری سمجھتے ہیں، ان میں سے وہ حضرات بھی جن کو خلوص کا پیکر سمجھا جاسکتا ہے، فکر و نظر کے نہایت بھیانک عدمِ توازن میں مبتلا ہیں۔ ان کا حال اس نادان ماں کا سا ہے جو ممتا کے اندھے جوش میں مدقوق بچے کو وہ سب کچھ کھلاتی رہتی ہے جس کی وہ خواہش ظاہر کرتا ہے، اور ذرا خیال نہیں کرتی کہ اس طرح کل مرنے والا مریض آج ہی دم توڑ دے گا۔ اسے ان لوگوں کی فہمائش مطلق نہیں بھاتی جو اس کو اس حرکت سے روک رہے ہوں، بلکہ بعض اوقات الٹا ان کو بچے کا دشمن سمجھنے لگتی ہے، اور بطورِ خود یہ گمان کرتی ہے کہ انہیں میرے دردِ دل کا حال کیا معلوم؟ میرے لختِ جگر کی حسرتوں اور خواہشوں کا انہیں کیا خیال؟ کون ہے جو اس کے اپنے بچے کی فطری محبت اور ہمدردی پر حرف رکھ سکے؟ مگر کیا قانونِ قدرت بھی اسی اندھی محبت کے احترام میں ٹھٹک کر کھڑا ہو جائے گا اور مسلسل مہلک بدپرہیزیوں کا جو طبعی نتیجہ نکلنا چاہیے اسے نکلنے سے روک دے گا؟ ٹھیک یہی حال ہے قومی مفاد کے ان "مامتا بھروں" کا جو اس کے چند دنیوی فوائد کی خاطر اس کی حیاتِ ملی کی رگِ جان پر چھری چلاتے جاتے ہیں۔ وہ تول کر نہیں دیکھتے کہ کیا چیز کھو رہے ہیں، اور اس کے عوض

کتنا حقیر فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ وہ نہیں سوچتے کہ ان کا مقصدِ زندگی دین کی شہادت ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا مقصودِ آفرینش دوسری قوموں کی نقالی اور ہمرکابی نہیں، بلکہ تمام اقوام کی رہبری ہے، اور ان کو اس لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے کہ ''الاسلام'' نامی خدائی نظامِ حیات کی خود پیروی کریں، اسی کی تمام دنیا کو دعوت دیں اور اسی کی اقامت میں اپنی اجتماعی کوششیں صرف کرتے رہیں۔ اس کے بخلاف وہ اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ مسلمان بھی میدانِ حیات میں مادی مسابقت کرنے والی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہے، اس کے پاس اپنا کوئی مستقل نقشۂ زندگی نہیں، کوئی مستقل دستورِ حیات نہیں، کوئی مستقل نصب العین نہیں، کوئی مستقل اصولِ سیاست نہیں۔ غور تو کیجیے! جو شخص ایک دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوتا ہے، اس کے اس اصولِ دستور سازی کو قولاً پاس کرتا یا عملاً تسلیم کرتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ جمہور کو حاصل ہے نہ کہ خدا کو، اور اس بنیاد پر دستور کی پوری عمارت تعمیر کرنے میں راج اور مزدور کا پارٹ ادا کرتا ہے، پھر جب دستور بن جاتا ہے تو اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرتا ہے، پھر جب وہ نافذ ہوتا ہے تو اس کے اصولِ انتخاب کے مطابق الیکشن لڑتا ہے اور ایک ایک قدم پر اسلامی اصولِ انتخاب سے بے تعلقی کا عملی اظہار کرتا ہے، پھر قانون ساز کونسل میں سیٹ سنبھالتا ہے اور اس حلف کے ساتھ سنبھالتا ہے کہ میں دستور کا، ملک کا، قانون کا وفادار رہوں گا، اور عموماً یہ حلف اس خدا کے نام سے لیتا ہے جس کی وفاداری کے سوا اصلاً کسی کی بھی غیر مشروط وفاداری اس کے دین میں حرام ہے، اور پھر کتاب و سنت سے اسی شانِ بے نیازی کے ساتھ مسائلِ زندگی کے متعلق قانون بناتا ہے...... وہی شخص، ہاں مسلمان نامی شخص، اگر اپنی مسجد میں آکر اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کی حقانیت واضح کرتا ہے، وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ پر دھواں دار تقریر کرتا ہے، دنیا کو أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ کا پیغامِ شاہی سناتا ہے، اور وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ سے امت مسلمہ کے فضائل و مناقب پر فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیرتا ہے، اور پھر اس کے قول و عمل کا یہ دورخا پن کچھ ایک دو دن نہیں بلکہ سالہا سال پوری زندگی میں جاری رہتا ہے، تو اس کی اس روش سے دنیا کیا سمجھے گی؟ وہ اقوامِ غیر کے سامنے کس امت کا شاہد بنے گا؟ اس کی کوششوں سے دین کی جڑیں مضبوط ہوں گی یا کھوکھلی؟ اگر آج تک کسی نے اپنے اصولوں کی ترویج و اقامت خود انہی کی عملی مخالفت کر کے کی ہو تو مسلمان بھی شوق سے ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا ہے، جیسا کہ واقعہ ہے، تو مسلمان یاد رکھیں کہ ان کے لیے قانون قدرت بدل نہیں جائے گا۔

اصولی غلطی

اس معاملے میں جو اصولی اور اساسی غلطی ہے، وہ اُسی بات کی ہے کہ جس کا اوپر ایک سر سری ذکر گزر چکا، یعنی لوگ رخصتِ اضطرار کا تعلق بھی پوری قوم سے اور اس کی جماعتی پالیسی سے ٹھیک اسی طرح جوڑ لیتے ہیں جس طرح کہ ایک فرد سے۔ دوسرے اُس رخصت کو بھی قوم کی مستقل پالیسی بنا لیتے ہیں اور ایسے سکون واطمینان کے ساتھ اس پر گامزن ہو رہتے ہیں گویا وہی کاروانِ ملت کی اصل شاہراہ ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ قرآن نے جو رخصت دی ہے وہ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ نیز غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی قیدوں کے ساتھ دی ہے، نہ کہ هَنِيئاً مَّرِيئاً۔ اور عقائدِ اسلامی کے خلاف اگر قولی یا عملی شہادت دینے کی رخصت ہے تو فرد کو ہے نہ کہ قوم کو۔ اور اگر بالفرض قوم کو بھی فرد پر قیاس کر لیا جائے تو بھی اس سے کسی جاہلی نظام سے پر سکون اور مسلسل تعاون کی رخصت کسی حال میں نہیں نکالی جاسکتی، بلکہ ایسا کرنا بھی انہی شرائط اور احساسات کے ساتھ ہو گا جن کے تحت ایک فرد کسی شے حرام سے اپنی حاجت بر آری کر سکتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ دل میں انتہائی کراہیت اور شدید نفرت ہو، کم سے کم مقدار میں استفادہ ہو، جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پانے کی بے تابانہ جدوجہد ہو، اور اس مجبوری کے عالم میں بھی کسی "حلال و طیب" صورتِ حال کی تدبیریں ہوں، بے قراریاں ہوں، زبان اس کے ذکر میں مصروف اور دل اس کی فکر میں ڈوبا ہوا ہو۔ لیکن اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو دراصل یہ رخصتِ اضطرار کا نہایت غلط استعمال ہو گا، یہ گویا اپنی رائے اور خواہش کے لیے آیت قرآنیہ کو آلۂ کار بنانا ہو گا۔

پیشوایانِ دین کی خصوصی ذمے داریاں

اس باب میں پیشوایانِ دین کی پوزیشن انتہائی نازک ہے۔ دوسروں کی غلط شہادت دین کو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتی جو ان حضرات کی پہنچا سکتی ہے۔ یہ کسی قوم کی انتہائی بد قسمتی ہے کہ جو لوگ اس کے کمر پٹے پکڑ کر اس کو حضیضِ جاہلیت[1] کی طرف جانے سے روکنے پر مامور ہوں، وہ بھی اس آوارہ روی میں اوروں کے ہم رکاب ہو جائیں۔ اس کے

---

[1] یعنی جاہلیت کی نچلی سطح۔ (مدیر ادارہ 'نوائے غزوۂ ہند')

یہ معنیٰ ہیں کہ نہ صرف باہر کی دنیا میں بلکہ خود ملت کے اندر بھی یہ تصور جڑیں پکڑنے لگے کہ اسلام کا اپنا کوئی نظامِ زندگی ہے ہی نہیں، اور مسلمان کے لیے بالکل جائز ہے کہ وہ جس اصولِ سیاست، جس اصولِ معاشرت، جس اصولِ حکومت اور جس اصولِ تمدن کو چاہے اپنا لے۔ ایسی مغالطہ آفریں حالت میں دستور ساز و قانون ساز مجلسوں کی شرکت اسی درجے کا تعاون علی الاثم نہ ہو گی جس درجے کا وہ فی الواقع ہے۔ بلکہ یہ عوارض اس کے درجاتِ حرمت کو کہیں بڑھادیں گے، جس طرح کہ شراب اور سود کی حرمت اپنے مذکورہ عوارض کی بنا پر ایک مثالی حرمت بن گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اگر مفادِ مسلمین اور مفادِ اسلام میں یہ لوگ فرق نہ کر سکیں، اور مفادِ مسلمین کے درد سے بے تاب ہو کر وہ اسلام کے بہترین مفاد کو قربان کر دیں، حالانکہ وہ اصلاً مفادِ اسلام ہی کے ذمہ دار ہیں نہ کہ مفادِ مسلمین کے۔ علاوہ ازیں انہیں اس رمز سے ناواقف نہ ہونا چاہیے کہ مفادِ مسلمین کا حقیقی تحفظ بھی مفادِ اسلام کے تحفظ ہی میں پوشیدہ ہے، اگرچہ ابتدا میں عارضی نتائج اس کے خلاف ہی کیوں نہ نظر آئیں۔ لیکن اگر ان کا حساس قلب مفادِ قومی کے معاملے میں اتنا صبر نہیں کر سکتا، اور ان کا جی چاہتا ہے کہ بروقت اس کے تحفظ کا سامان ہو تا رہے تو بھی ان کو سوچنا چاہیے کہ اس قومی خدمت کے لیے ان کی ملت میں ماشاء اللہ کوئی قحط الرجال نہیں ہے۔ وہ جن کرسیوں پر بیٹھنا چاہتے ہیں ان پر وہ خود اگر نہ بیٹھیں تو دوسرے "خدامِ ملت" انہیں پر کرنے کے لیے ہمہ وقت موجود ہیں اور بہ تعداد کثیر موجود ہیں۔ پھر ان پر کیا مصیبت آئی ہے، جو بے دینی کا یہ عَلَم اپنے ہی ہاتھوں اٹھانے کے لیے وہ بے قرار ہیں۔ کیوں نہیں اسے وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے اور خود اپنے اصل مقصدِ حیات کی قندیل روشن رکھتے؟ اسلام، قرآن، اللہ اور رسول ﷺ کا ان پر کم از کم اتنا تو حق ہے ہی کہ وہ اپنے عمل سے ان حرکتوں کو سندِ تقدیس نہ عطا فرمائیں، جن کو خدا بیزاری کا طوفان جنم دے رہا ہے۔ یہ لوگ تو عالمِ اسباب میں اسلام کی آخری پناہ گاہ ہیں، اگر ان کے دربار سے بھی اس غریب کو روکھا جواب مل گیا، تو اب وہ اپنا حالِ زار کسے سنانے جائے گا؟

یہ بزرگ یاد رکھیں کہ نظام حکومت اور سیاست کی حدود اب قریب قریب وہاں پہنچ کر ختم ہوتے ہیں جہاں انسانی زندگی کے مسائل ختم ہوتے ہیں، اس لیے کسی جاہلی نظام سے تعاون اور عملی اظہارِ وفاداری ان کو اپنی کسی حد پر بہ مشکل ہی ٹکنے دے گا۔ یہ تعاون اس کے لیے ایک دلدل ثابت ہو گا جس میں پھنسے ہوئے ان کے قدم روز بروز اور گہرائی میں دھنستے چلے جائیں گے۔ وہ صرف اسی پر مجبور نہ ہوں گے کہ اپنے ملک میں سیکولرزم کا قصیدہ پڑھیں، بلکہ

باہر کی دنیا سے بھی اگر کہیں اسلامی نظام کا لفظ سننے میں آگیا تو اس سے انہیں اپنی پیشانی پر بل لانا پڑے گا، زبان سے اس توقع اور تمنا کا اظہار کرنا پڑے گا کہ ''ان شاءاللہ'' انجام کار ''وہاں'' بھی لادینی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ بلکہ شاید یہ بھی کافی نہ سمجھا جائے اور ان سے کہلوایا جائے گا کہ ہمارا یہ نظام بھی اسلامی نظام ہی ہے، اگرچہ اس کے آئین اور قانون میں اللہ اور رسول، قرآن و سنت کا نام کہیں نہیں۔ جاہل اور دیوانہ ہے وہ شخص جو اسے جاہلی اور غیر اسلامی نظام کہے۔ اس بنیادی مصالحت کے بعد نہ پوچھیے کہ ان کے حضور مختلف مسائل زندگی سے متعلق کیسے کیسے جاہلانہ حل پیش کیے جائیں گے، اور ان سے چاہا جائے گا کہ ان پر آنکھ بند کر کے ''اسلامیت'' کا ٹھپہ لگاتے جائیں، یا کم از کم سکوتِ مصلحت آمیز سے اس کے لا بأس به (بے مضائقہ) ہونے کا تصور دلا دیں۔

''اهون البليّتين'' کی سپر

اس بحث میں ''اهون البليّتين'' کے فقہی ضابطے کو ایک ڈھال سا بنالیا گیا ہے۔ اور دین و شریعت کے کتنے ہی اصولی مطالبوں کو اسی ڈھال پر لے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جہاں تک مسئلۂ زیر بحث کا تعلق ہے یہ دو بلاؤں میں سے ہلکی بلا کا اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ بجائے خود ایک نئی بلا کی تخلیق ہے جو موجودہ بلا (یا بلاؤں) سے کہیں زیادہ خود مہلک ہے۔ مان لیجیے کہ مسلمان کے حصے میں اس وقت صرف بلائیں ہی بلائیں رہ گئی ہیں اور اس کے لیے دو یا دو سے زائد بلاؤں میں سے کسی نہ کسی بلا کا انتخاب کرنا ہی مقدر ہے، کیونکہ اب اس کے لیے پسند کے قابل سارے ہی راستے بند ہیں۔ تو کیا سب سے ہلکی بلا یہی رہ گئی ہے کہ وہ نظامِ جاہلی کا علم بردار بن جائے، لادینیت کا پرچار کرتا پھرے، قرآن و سنت کو مسجدوں میں بند کر کے انسانی حاکمیت کی بنیاد پر قانون سازی کرنے لگے، اور پھر وہ سب کچھ کرے جو اس کا تقاضا ہے؟ کیا اسلام کے نمائندوں، حق کے شاہدوں، معروف کے علم برداروں اور اقامت دین کے ذمہ داروں کے لیے یہی سب سے ہلکی مصیبت ہے تو خدارا بتایا جائے سب سے بڑی مصیبت کیا ہو گی؟ کتنا عجیب و غریب ہو گا وہ دین جو اپنی بنیادی تعلیمات تک کی مسلسل خلاف ورزی کو بھی اهون البليّات کہہ کر ٹال دے۔

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ بلا جوئی بھی اس حال میں کی جارہی ہے جب اچھی راہیں موجود ہیں۔ کسی دھارمک پرچارک، کسی نیشنلسٹ نیتا، کسی سوشلسٹ رہنما، کسی کمیونسٹ لیڈر کی زبان پر قفل نہیں، کوئی نہیں، جو کسی ''بلا'' کے اختیار

کرنے پر ہی مجبور ہو، بلکہ سارے کے سارے پوری بے باکی سے اپنے مقاصد کی اشاعت و اقامت میں دن رات منہمک ہیں، مگر ایک دینِ حق کے علم بردار ہی ایسے ہیں جن کے لیے ساری آزادیاں چھنی ہوئی ہیں، جو مجبور ہیں کہ زبان پر اپنے مقصدِ حیات کا نام بھی نہ لائیں، جن کے مقسوم (یعنی حصے) میں بس بلائیں ہی بلائیں ہیں، وہ نہ اپنے مشن کا اظہار کر سکتے ہیں، نہ اس کی اشاعت کر سکتے ہیں، نہ اس کی دعوت دے سکتے ہیں، نہ اس کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں! یہ حالات کا کیسا غلط اندازہ ہے؟ کوئی آنکھیں رکھنے والا یہ کیسے باور کر سکتا ہے کہ آج کا مسلمان اپنی منزل مقصود کی مخالف سمت ہی میں حرکت کرنے پر مجبور ہے؟ یقیناً صحیح سمت چلنے کی راہ پوری طرح کھلی ہوئی ہے[1]، یہ دوسری بات ہے کہ ہمارا ذوقِ نگاہ ہی فاسد ہو چکا ہو اور ہمیں بس مختلف بلاؤں میں انتخاب ہی کی سوجھتی رہے۔ کہیں اس اندازِ فکر کی تہہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ سوئے ظن تو کام نہیں کر رہا ہے کہ ہم اس کے دین کا نام لیتے ہی اپنے گھروں سے اچک لیے جائیں گے، زمین ہمارے لیے تنگ ہو جائے گی اور آسمان ہم پر ٹوٹ پڑے گا؟ اگر ایسا ہے تو صد افسوس، کیونکہ اس نے تو ہم سے کچھ اور ہی وعدے کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اھون البلیتین کے اصول کا نہایت غلط انطباق کیا جارہا ہے۔ اس اصول کا موقع استعمال کچھ اس طرح کے حالات میں ہوتا ہے کہ فرض کر لیجیے مسلمانوں کا ایک گروہ کسی کشتی میں سوار ہے، اس پر دشمن نے گولہ باری کر دی یا اس میں آگ لگا دی، جس کے بعد ان مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے ہوں، یا تو وہ بدستور کشتی میں بیٹھے رہیں اور گولہ باری اور آگ کی ہلاکتوں سے دوچار ہوں یا پھر سمندر میں پھاند پڑیں اور غرقابی کے خطرات مول لیں۔ ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو رویہ مقابلتاً کم خطرناک اور کچھ زیادہ قابل برداشت معلوم ہو، اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اب اندازہ لگائیے محکوم مسلمانوں کے حالات کا۔ کیا فی الواقع وہ جاہلیتِ متسلط سے دل کھول کر تعاون کرنے اور اسلام کے صریح اصول و احکام کی خلاف ورزیاں کرنے پر ویسے ہی مجبور ہیں جیسے کہ مذکورہ بالا مثال کے اہل کشتی آگ اور پانی کی دو ہلاکتوں میں سے کسی نہ کسی ہلاکت کے اختیار کرنے پر مجبور ہیں؟

---

[1] صحیح سمت چلنے کی مکمل راہیں کبھی بند بھی نہیں ہو سکتیں کہ بلاؤں کے انتخاب کے چکر میں پڑا جائے کیونکہ فرمان رسول ﷺ ہے: "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اسی پر لڑتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔" (مسلم، مشکوۃ کتاب الجہاد)

اسوۂ یوسفی کا غلط ”استعمال“

جاہلی اور غیر اسلامی نظام سے تعاون کی بحث میں سیدنا حضرت یوسفؑ کی مصری زندگی کو بھی بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ استدلال نہیں بلکہ ”استعمال“ ہے جو اپنے افکار و اعمال کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ اصل حالات سے بے خبری ہے جو مسئلۂ زیر بحث کو حضرت ممدوح کے واقعے سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ استنباط اس وقت صحیح ہوتا جب یہ ثابت ہوتا کہ حضرت یوسفؑ نے حکومت کا کُل اقتدار نہیں بلکہ جزئی اقتدار حاصل کیا تھا، اقتدار سنبھالتے وقت وہ منصب نبوت پر فائز ہو چکے تھے اور فرعونِ مصر اس وقت بدستور غیر مسلم تھا۔ مگر یہ تینوں ہی باتیں نہ صرف یہ کہ ثابت نہیں، بلکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہی نظر آتی ہے۔ آگے ہم اس اجمال کی مدلل تفصیل پیش کریں گے، اس سے پہلے ایک ضروری اصولِ استنباط سمجھ لیجیے۔

مسائلِ شرعیہ پر غور و فکر کا اصول یہ ہے کہ ہمیشہ اصل سے فرع کی طرف، منصوص سے مفہوم کی طرف، مفصل سے مجمل کی طرف، واضح سے مبہم کی طرف اور محکم سے متشابہ کی طرف چلا کرتے ہیں۔ کسی بات کے سوچنے اور استنباط کرنے کا یہ طریقہ قطعاً غلط، غیر علمی اور غیر دینی ہے کہ کسی مجمل اور مبہم آیت یا حدیث کے بعید اشارات سے کرید کرید کر نکالا جائے، درآں حال یہ کہ اس کے لیے واضح اور محکم نصوص موجود ہوں۔ اگر آپ اُمت کی تاریخ افتراق پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ افتراق کا یہ مہلک بالعموم اسی غلط اندازِ فکر و استنباط کا ثمرہ ہے۔ خدا کی کتاب اپنے بارے میں تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کا نعرہ لگاتی رہی مگر غیر متوازن دماغوں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور واضح نصوص کی موجوگی میں وہ مجمل اور مبہم آیات و احادیث کی طرف رجوع کرتے رہے اور نت نئے افکار و تصورات دین کے نام پر اختراع کرتے رہے۔ اور جب قرآن و سنت کے بعض مجمل بیانات سے انہوں نے اپنی پسند کی ایک بات نکال لی تو پلٹ کر ان نصوص کی طرف متوجہ ہو لیے جو مسئلۂ متعلقہ کے بارے میں نہایت واضح تھے اور اس لیے اس کی نوعیت معین کرنے کے وہی اصل حق دار بھی تھے۔ یہاں پہنچ کر بجائے اس کے کہ وہ ان واضح نصوص کی روشنی میں اپنے غلط استنباط کی تصحیح کر لیتے، انہوں نے یہ کیا کہ الٹا انہی نصوص کے ساتھ دھینگا مشتی شروع کر دی اور تاویلات کی خراد پر چڑھا کر انہیں اپنے مزعومات کے مطابق ڈھال لیا۔ یہ اگرچہ ہے بڑی افسوس ناک بات، لیکن اس کے وجود کا انکار بھی ممکن نہیں، اور یہ ساری افسوس ناک صورتِ حال اس کج اندیشی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے محکماتِ دین کو

پیچھے اور اشارات وکنایاتِ نصوص کو آگے رکھ لیا، پھر اپنے اپنے ذوق کے مطابق نئے نئے فلسفے اور نقطے ایجاد کرتے اور سب کو قرآن سے لاکر وابستہ کرتے رہے۔ حالانکہ سلامتی کی راہ سمتِ مخالف میں تھی۔

اصول کو سامنے رکھ کر حضرت یوسفؑ کی "ملازمت مصر" کے معاملے پر غور کیجیے:

(الف) کفر و جاہلیت کے تعاون اور موالات کے بارے میں قطعی، محکم اور واضح نصوص موجود ہیں؛ مثلاً وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ اور وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ (ای بالطاغوت) اور إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ اور وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ اور اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء اور هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ اور لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء اور إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وغیرہ آیات، نیز من رأى منكم منكرا فليغيره الخ...... لا تستضيئوا بنار المشركين، انا برى من كل مسلم بين ظهرانى المشركين وغیرہ احادیث۔

(ب) بلا استثنا تمام انبیائے کرام کا مقصدِ بعثت یہ تھا کہ لوگوں[1] کو الٰہِ واحد کی بندگی (پرستش اور اطاعت) کی دعوت دیں (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ) اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے دین (نظامِ عقائد و اعمالِ حیات) کو اللہ کی اس زمین پر قائم کریں (شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ......أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ)

(ج) بلا استثنا سارے ہی انبیا کی قطعی پوزیشن یہ تھی کہ وہ دوسرے انسانوں کے مطاعِ مطلق ہیں (وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلاَّ لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّهِ) "اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانیے اللہ کے فرمان سے" (سورۃ النساء: ۶۴)۔ نہ یہ کہ وہ خود ہی کسی اور کے، حتیٰ کہ علم بردارانِ کفر کے پیرو، مطیع اور چاکر ہوں۔

ان بنیادی باتوں کو نگاہ میں رکھیے، پھر قرآن کے ان لفظوں پر نظر ڈالیے جن میں حیات یوسفی کی مصری تاریخ بیان کرتے ہوئے ان کی زبان سے اجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الأَرْضِ "مجھ کو مقرر کرو ملک کے خزانوں پر" (یوسف: ۵۵) کا

---

[1] منکر کی تعریف اور اس کے حدود و وسعت کو سامنے رکھیے جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

مطالبہ (نہ کہ درخواست) مذکور ہے۔ اس کے بعد غور کیجیے کہ اس واقعے سے نظامِ کفر کے ساتھ "تعاون" کی سند جواز کسی طرح بہم پہنچتی ہے؟ ایک طرف تو اتنے سارے محکم نصوص اور واضح ہدایات ہیں، دوسری طرف قرآن کا یہ مجمل بیان کہ حضرت یوسفؑ نے شاہِ مصر سے فرمایا تھا "مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر"۔ اس دولفظی بیان کے سوا نہ تو قرآن اس کی وضاحت کرتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا اس وقت دینی مقام کیا تھا؛ آیا ابھی وہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے تھے یا نہیں، نہ وہ اس حقیقت کا کوئی انکشاف کرتا ہے کہ اس "تقرر" کے وقت خود شاہِ مصر کا کیا حال تھا؛ اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش ہو چکی تھی یا نہیں، اور اگر پیش ہو چکی تھی تو اس نے جواب کیا دیا تھا؛ انکار میں یا اقرار میں۔

اب صورتِ واقعہ کے اس مجمل خاکے میں تفصیل کا رنگ بھرنا تو بہر حال ضروری ہے کہ اس کے بغیر مسئلۂ تعاون کے ضمن میں اس سے استدلال کیا ہی نہیں جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ رنگ کیا ہو؟ یعنی کہ اس اجمال کی تفصیل کیا سمجھی جائے؟ کیا ایسی جو مذکورہ بالا نصوص اور محکمات سے متصادم ہو جاتی ہو؟ یا ایسی جو ان سے ہم آہنگی رکھتی ہو؟ اگر کوئی دین کے محکم ضوابط اور قرآن کے اصولی حقائق کی پرواہ نہیں کرنا چاہتا تو بلاشبہ اس کے لیے ہر راہ کھلی ہوئی ہے، وہ جس پر چاہے پوری آزادی کے ساتھ جاسکتا ہے اور ایک پیغمبر کے بارے میں جو تصورات چاہے رکھ سکتا ہے۔ وہ حضرت یوسفؑ کو فرعون مصر کے سامنے ملازمت کی درخواست دینے والا ٹھہرا سکتا ہے، وہ خزائن الارض کا ترجمہ مالیاتِ حکومت سے کر سکتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ اس حصولِ اقتدار یا حصول ملازمت کے وقت حضرت یوسفؑ خلعت نبوت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے، اور فرعون بدستور کافر اور مشرک تھا، بایں ہمہ وہ درخواستِ ملازمت پیش کرتے ہیں، فرعون اسے شرفِ قبولیت عطا فرماتا ہے، اور حضرتِ ممدوح دوش مبارک پر نبوت کی خلعتِ ربانی ڈالے کافر و مشرک فرعون کے زیرِ سایہ ایک فرض شناس اور اطاعت گزار حاکم کا پارٹ ادا کرنے لگتے ہیں...... لیکن جن کے اندر اتنی جرأت نہ ہو وہ تو غور و فکر کا یہ رویہ اختیار کرنے سے رہے، وہ اس قسم کا تصور بھی اگر کریں گے تو قرآن کے وہ محکم نصوص، جن کا حوالہ ابھی گزرا، ان کے سامنے آ کھڑے ہوں گے، وہ پوچھیں گے، جب بلا استثنا ہر نبی مطاعِ مطلق بن کر آیا ہے تو تمہیں کیسے یہ جسارت ہوئی کہ یوسفؑ صدیق کو کافر و مشرک فرعون کا مطیع بنا دکھاؤ؟ وہ سوال کریں گے کہ ہر نبی تو دنیا میں خدا کا دین قائم کرنے آیا تھا، یہ تم حضرت یوسفؑ کو دینِ فرعون کا محافظ و نگراں

کس بنا پر کہتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہر پیغمبر تو خدا کی بندگی، اور طواغیت سے بغاوت کرانے پر مامور تھا، تم نے کیسے گوارا کیا کہ یوسفؑ کو فرعون جیسے طاغوت کا اطاعت گزار مان لو؟ ظاہر ہے کہ ان جیسے سوالوں کا جواب دینا آسان نہیں۔ اس لیے سلامتیٔ فکر کی راہ یقیناً دوسری ہو گی۔ یہ راہ وہ ہو گی جو ان نصوص سے کترا کر نہ جاتی ہو بلکہ ان کے بیچ سے ہو کر نکلتی ہو، جو اس اصولِ تاویل کی روشنی میں متعین ہوئی ہو جس سے ابھی آپ تعارف حاصل کر چکے ہیں۔ غور و فکر کا یہ طریقہ یقیناً واقعے کی کوئی اور ہی شکل چاہے گا۔ اس لحاظ سے حقائق کچھ اس طرح کے ہونے چاہییں:

(۱) حضرت یوسفؑ نے اقتدارِ حکومت کے لیے درخواست نہیں کی، بلکہ اس کا مطالبہ کیا ہو گا۔

(۲) اقتدار بھی جزئی نہیں بلکہ کلّی مانگا ہو گا۔

(۳) کیا عجب کہ حضرتِ ممدوح اس وقت تک منصب نبوت پر مامور نہ ہوئے ہوں۔

(۴) کچھ بعید نہیں، جو انتقالِ اقتدار کے وقت فرعون مشرف بہ اسلام ہو چکا ہو۔

واقعے کی تصویر کچھ اسی رنگ میں اس لیے ہونی چاہیے کہ قرآنی معیارِ نبوت پر اگر تصویر پوری اترتی ہے تو وہ یہی تصویر ہے۔

واقعے کی صحیح تصویر دلائل کی روشنی میں

لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ صرف اصولوں کی بنیاد پر ہی واقعے کی یہ تصویر مانیں، اس لیے مزید اطمینان قلب کے لیے یہ بھی سن لیجیے کہ قرآن کے واضح اشارات اور تورات کی بعض تصریحات اور اس کے بعض کنایات سے واقعے کی روح یہی بنتی ہے، جیسا کہ بننا چاہیے۔ کیونکہ کتابِ الٰہی کی ممتاز ترین صفت ہی یہی ہے کہ اس کے مطالب میں شمہ برابر بھی اختلاف و تضاد نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلے کی بابت وہ کچھ نہ کہے، دور و نزدیک کا کوئی اشارہ بھی نہ کرے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی بات کہے یا ضمناً کوئی اشارہ بھی کرے اور وہ اس کے دوسرے نصوص و مضامین میں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ پس جب اس نے نبوت کا خاص معیار قائم کیا تو ممکن نہ تھا کہ کسی نبی کے احوال میں وہ بات کہی جائے جو اس معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ حضرت یوسفؑ بھی ایک نبی تھے، اس لیے ان کے بارے میں بھی اس

اصول سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ان کے حالات میں جن امور کے ہونے کو ہم نے تقاضائے اصول بتایا وہ قرآن اور تورات دونوں کے الفاظ اور بین السطور سے بالوضاحت مترشح ہوتے ہیں۔ جن کی مختصر تفصیل یہ ہے:

(۱) حضرت یوسفؑ نے اقتدارِ حکومت کے لیے درخواست نہیں دی تھی بلکہ مطالبہ کیا تھا، اس کا ثبوت قرآن کے ان لفظوں سے ملتا ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ○قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الأَرْضِ......الخ (سورۃ یوسف:۵۴،۵۵)

"اور بادشاہ نے کہا: 'اسے میرے پاس لاؤ اس کو میں اپنا مقرب خاص بناؤں گا' پس جب (وہ آیا اور) اس نے اس سے گفتگو کی تو کہا آج سے تم میرے حضور صاحب مرتبت اور میرے معتمد ہو۔ تب یوسفؑ نے کہا کہ مجھے 'خزائنِ ارض' پر مقرر فرما دیجیے۔"

صاف بات ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اِجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الأَرْضِ اس وقت فرمایا جب شاہِ مصر آپ کو اپنا مقرب خاص، اپنا معتمد اور اپنی نگاہوں میں ذی وجاہت ٹھہرانے کا آپ کے روبرو اعلان کر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ "مکین امین" ٹھہرانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انہیں اس نے اپنے دربار کا ایک "رتن" بنا کر رکھنا چاہا تھا، بلکہ اس کا صریح مدعا یہ ہے کہ اس نے کاروبارِ حکومت کے ضمن میں ان کو اپنا معتمد مقرر کرنے کی پیشکش کی تھی۔ اب جو اس کے جواب میں حضرت موصوف نے اِجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الأَرْضِ کہا تو اس کی نوعیت درخواست کی کیونکر ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک کھلا ہوا مطالبہ تھا، جو حضرت کی فراستِ ایمانی کا ایک غیر معمولی ثبوت ہے۔ ورنہ اگر بیسویں صدی کا کوئی خان بہادر ہوتا تو کُلبۂ زنداں سے آتے ہی تختِ اقتدار کی اس غیر معمولی پیش کش کو سن کر فرعون کے روبرو فرش ہو جاتا، اور اگر کوئی کامریڈ ہوتا تو وہ بھی اس کے سامنے ادب و تشکر کا سراپائے خاموش ضرور ہی بن جاتا، اور پھر انتظار میں ہوتا کہ دیکھیں اس "مکین امین" ہونے کی عملی تعبیر کیا ہوتی ہے۔ مگر حضرت کی فراستِ ایمانی نے، جس پر پیچھے سے نورِ نبوت بھی پڑ رہا تھا، معاً موقع کی نزاکت محسوس کر لی، اور اظہار شکر و امتنان کا تصور کیے بغیر اس کے سامنے آپ نے یہ

مطالبہ رکھ دیا کہ مجھے سارے "خزائن ارض" پر متصرف کر دیجیے، تب تو میں اس تمکن کو قبول کرتا ہوں، ورنہ آپ کے اقتدار کا رتھ کھینچنے کے لیے ہر گز تیار نہیں ہوں، کہ بندۂ حق اس لیے دنیا میں آتا ہی نہیں۔

(۲) مطالبہ بھی جزوِ اقتدار، یعنی وزارتِ مال کا نہ تھا، بلکہ عملاً کلی اختیار کا تھا، اتنے اقتدار کا جو کاروبارِ سلطنت کے آزادانہ سرانجام دینے کے لیے ضروری ہے۔مَلِک اور فرعون ہونے کا لفظی خطاب، چند موتیوں کا کھلونا جسے تاج کہتے ہیں، اور سرخ وسیاہ آبنوس کے چند تختے جسے تخت کہا جاتا ہے، یہ چیزیں خواہ عرف عام میں کتنی ہی اہمیت اور عظمت کیوں نہ رکھتی ہوں، مگر عملاً نظامِ حکومت میں یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پس یہ چیزیں تو فرعون مصر کی اپنے پاس رہنے دیں اور باقی کے بارے میں آپ کا مطالبہ ہوا کہ سب میرے حوالے کر دی جائیں۔ قرآن میں اس کلّی اقتدار کی طرف کھلے اشارے اور تورات کی واضح تصریحات موجود ہیں۔

بقولِ قرآن:...... آپ[1] نے سارے خزائنِ ارض کا مطالبہ کیا تھا، جس کا مطلب سارے ہی ذرائع حکومت ہے۔ لفظِ خزائن اصطلاحِ قرآنی میں غلے کے انبار اور سیم وزر کے ڈھیر کے معنٰی میں نہیں آتا، جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے؛ اس کے لیے قرآنی اصطلاحات "کنز"، "مال" اور "ثمرات" وغیرہ کی ہیں۔

آپ کے ہاتھ میں وزارتِ داخلہ (ہوم منسٹری) بھی تھی۔ آپ کے بھائی بنیامین کو قدرت نے ایک خاص حکمت سے آپ کے پاس رکوادیا، اس کی بابت قرآن فرماتا ہے کہ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (یوسف کے لیے یہ صحیح نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کے تحت پکڑتا)، معلوم ہوا کہ پولیس کے اختیارات بھی آپ ہی کے ہاتھ میں تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ صاحبِ قضا(جج) بھی خود آپ ہی تھے، اور حکومت کی عدلیہ نام تھا آپ ہی کی ذات مبارک کا۔ اگر صرف وزیرِ غذا یاوزیر مال ہوتے تو مقدمہ آپ کے حضور پیش نہ ہوتا، نہ آپ کے بھائی آپ سے بنیامین کی رہائی کی التجا کرتے۔

عملاً تختِ سلطنت پر جلوہ افروز بھی آپ ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کے والدین سرزمین کنعان سے مصر پہنچے تو:

---

[1] خزائن کی قرآنی اصطلاح کا مطلب علمائے ادب و قرآن نے بیان کیا ہے: خزائن الله ای مقدوراته الخ یعنی خزائن اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرتِ خاص کی تمام چیزیں اور باتیں ہیں۔ (مفردات امام راغب)

وَرَفَعَ أَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ (سورۃ یوسف:۱۰۰)

"اور آپ نے اپنے والدین کو اٹھا کر تخت پر بٹھالیا۔"

اور ان کے سامنے اپنے اقتدار کا حال شکر و سپاس کے ساتھ یوں بیان فرمایا:

رَبِّ قَدۡ آتَيۡتَنِي مِنَ الۡمُلۡكِ (سورۃ یوسف:۱۰۱)

"پروردگار! تُو نے مجھے حکومت بخشی ہے۔"

یاد رہے کہ جس وقت آپ یہ سب کچھ کہہ رہے تھے، فرعونِ مصر بقید حیات تھا، (پیدائش، باب ۴۷)۔ کیا یہ کارنامے اور اقوال کسی وزیر غذا اور افسرِ مال کے ہوسکتے ہیں، یا ایک حاکمِ مطلق ہی سے ممکن ہیں؟

بقولِ تورات: فرعون حضرت یوسفؑ سے پہلی ملاقات اور گفتگو کے بعد ہی آپ کی فراست کا گرویدہ ہوجاتا ہے اور اسی آن اپنے خدام کو خطاب کر کے کہتا ہے:

'کیا ہم کو ایسا آدمی، جیسا یہ ہے، جس میں خدا کی روح ہے، مل سکتا ہے؟' اور فرعون نے یوسف سے کہا: 'چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے اس لیے تیری مانند دانش مند اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔' اور فرعون نے یوسف سے کہا: 'دیکھ میں تجھے سارے ملکِ مصر کا حاکم بناتا ہوں، اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنادی اور اسے باریک کتان کے لباس میں آراستہ کروا کر سونے کا طوق اس کے گلے میں پہنایا اور اس نے اسے اپنے دوسرے رتھ میں سوار کرا کر اس کے آگے آگے یہ منادی کرادی کہ گھٹنے ٹیکو، اور اس نے اسے سارے ملکِ مصر کا حاکم بنادیا۔' اور فرعون نے یوسف سے کہا: 'میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملکِ مصر میں اپنا ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔'

اور فرعون نے یوسف کا نام "جہاں پناہ" رکھا۔ (کتاب پیدائش:۳۸۔۴۵)

ان روز روشن سے زیادہ تصریحات کو پڑھیے اور ان لوگوں کے حسن فکر کی داد دیجیے جو حضرت یوسفؑ کو فرعون کا بس ایک افسرِ مال گمان کرتے ہیں اور انہیں جیسے یہ کچھ ناگوار سا ہے کہ حضرتِ ممدوح کو کلّی اختیارات کا مالک سمجھیں۔

(۳) گمانِ غالب یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ اس وقت منصبِ نبوت پر سرفراز بھی نہیں ہوئے تھے جب شاہِ مصر نے انہیں یہ اختیارات سونپے۔ قرائن حسب ذیل ہیں:

(الف) تورات کا بیان ہے کہ اس وقت حضرتِ موصوف کی عمر صرف تیس سال تھی (پیدائش: ۴۶)۔ قرآن نے اگرچہ ان کی عمر کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، مگر اس کے اشارات تورات کے بیان کی تائید ہی میں ہیں۔ قرآنی بیان یہ ہے کہ جب وہ مصر میں بکے ہیں تو ابھی ان کا دورِ شباب شروع بھی نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ دور اس وقت شروع ہوا جب آپ عزیز مصر کے یہاں چند سال گزار چکے (وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ)۔ پھر جلد ہی جیل جانا ہوتا ہے اور کچھ سال قید و بند کی زندگی گزارنے کے بعد رہا ہوتے ہیں۔ اندازہ کیجیے تو قرآن سے بھی یہی کوئی تیس بتیس برس کی عمر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس باب میں تورات کے بیان کو صحیح نہ سمجھیں۔ اب غور کیجیے کہ یہ پختگیٔ فہم و عقل کی عمر ہے یا نہیں؟ اور عموماً نبوت کے لیے سنت الٰہی کس سن و سال کا انتخاب کرتی رہی ہے؟ جہاں تک اندازہ کام کرتا ہے چالیس ہی سال کی عمر میں بالعموم حضراتِ انبیا کو بارِ رسالت اٹھانے پر مامور کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر یہ قیاس کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ حضرت یوسفؑ حکومت سنبھالتے وقت نبی نہ تھے، اور اب تک آپ نے دعوتِ توحید کا جو کام کیا تھا وہ بحیثیت امتِ یعقوبی کے ایک فرد کے تھا۔ اور یہ رازِ حق آپ والد بزرگوار کی آغوشِ تربیت سے سیکھ کر آئے تھے اور ارتقائے فہم و شعور کے ساتھ اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔

(ب) نظام سلطنت سنبھالنے کے کوئی آٹھ نو سال بعد آپ کے بھائی غلہ لینے آپ کے پاس آئے تو ایک موقع پر آپ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں:

أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَباً شَيْخاً كَبِيراً ...... الخ (سورۃ یوسف: ۷۸)

”اے عزیز! اس (بچے) کا باپ بہت بوڑھا ہے۔“ الخ

نبوت کا شرف و امتیاز ایسا نہیں ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو کسی اور خطاب سے مخاطب کیا جائے۔ اگر اس وقت حضرت یوسفؑ نبی ہوتے تو ان کے بھائی انہیں عزیز کہنے کے بجائے یقیناً اللہ کا رسول ہی کہہ کر مخاطب کرتے۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ نبی کا خطاب عزیز کے مقابلے میں کہیں محترم و مکرم ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ موقع اسی کا متقاضی تھا۔ وہ اپنے بھائی بنیامین کو چھوڑ دینے کے لیے رحم کی التجا کر رہے تھے، اور اس راز سے ناواقف نہ تھے کہ "نبی" یوسف کے ہوتے ہوئے "عزیز" یوسف سے رحم کی درخواست کرنا حماقت ہے۔ "عزیز" تو نام ہے پیکرِ جاہ و اقتدار کا، جو پسیجنا شاذ و نادر ہی جانتا ہے، جبکہ نبوت رحم و شفقت کا مجسمہ ہوتی ہے، اور نہیں جانتی کہ سائل کو ٹھکرایا کس طرح جاتا ہے۔

(۴) فرعونِ مصر حضرت یوسفؑ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا۔ قرائن و دلائل یہ ہیں:

(الف) تورات کی عبارت ہم ابھی نقل کر آئے ہیں، اس کے ان لفظوں پر دوبارہ نظر ڈالیے: "کیا ہم کو ایسا آدمی جیسا یہ ہے، جس میں خدا کی روح ہے۔ الخ"

"فرعون نے یوسف سے کہا: چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے۔"

کیا یہ الفاظ کسی کافر، کسی مشرک، کسی باغیٔ خدا کے ہو سکتے ہیں؟ فرعون "خدا کی روح" اور "خدا کے سمجھا دینے" کے الفاظ اس طرح بول رہا ہے گویا توحید کا کوئی بڑا رمز شناس ہے۔

(ب) عقلاً یہ بات ایک عجوبے سے کم نہیں کہ فرعون کفر و شرک کا دلدادہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے شخص کو اپنا مختار کل بنا دے جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی کفر و شرک کے خلاف تیغِ بے نیام تھا، اور باہر نکلنے کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہو گیا ہو گا۔ پورا فلسفۂ تاریخ اس امر کی توجیہ نہیں کر سکتا کہ باہم فطری مخالفت رکھنے والے دو حقائق یوں ہم آہنگ ہو گئے ہوں گے۔ یہ تو قطعی بات ہے کہ حضرتِ یوسفؑ نے فرعون کے سامنے دعوتِ توحید پیش کی ہو گی، بلکہ یہ بھی اغلب سے بھی کچھ زائد ہے کہ فرعون نے "خدائی روح رکھنے والے" اس پاک انسان کی بات مان لی ہو گی۔ ورنہ ایک کافر، ایک مشرک، ایک "فرعون" (اپنے معروف معنوں میں) کافر، مشرک اور "فرعون" رہتے ہوئے بھی ایک خاموش مومن اور ایک موحد ہی نہیں، ایمان و توحید کے پر جوش داعی سے اتنا خوش اور راضی کیسے ہو سکتا

ہے کہ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے؟ یقیناً اگر ہو سکتا ہے تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کفر و ایمان دونوں ہی کچھ کچھ اپنی جگہیں چھوڑ دیں، اور اگر ان میں سے ایک بھی اپنی خودی پر قائم رہا تو یہ اتحاد و اختلاف ممکن نہیں۔ بیسویں صدی کے کفر و ایمان تو اتنے "فراخ دل اور روادار" ضرور ہیں، مگر بیسویں صدی قبل مسیح میں اس رواداری کا پتہ لگانا بسا دشوار ہے۔ خیر کفر کی حد تک دشوار نہ سہی مگر ایمان (اور ایمان بھی ایمانِ یوسفی) کے بارے میں یہ سوئے ظن دل کو کس طرح گوارا ہو؟

چنانچہ علمائے اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جو فرعون کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ مشہور مفسر مجاہد فرماتے ہیں کہ شاہِ مصر مسلمان ہو گیا تھا (ابنِ جریر، کشاف)۔

ان حقائق اور امکاناتِ قریبہ کا جائزہ لیجیے اور پھر دیکھیے کہ حضرتِ یوسفؑ کی تاریخ کا صحیح مرقع کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ان قرائن اور حقائق کی موجودگی میں واقعۂ زیرِ بحث کی ایسی صورت گری پر اصرار کرنا کوئی مناسب بات ہو گی جو اپنے دامن میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی ذات سے متعلق بڑی پستیاں بھی رکھتی ہے، اور اس کے لیے کوئی دلیل اور قرینہ بھی موجود نہیں، سوائے اس کے کہ ہم نے خزائن کا ترجمہ مال و دولت پڑھ رکھا ہے، فرعون کے معنیٰ ازلی و ابدی کافر کے جانتے ہیں، جو کبھی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، اور حضرت یوسفؑ کو قرآن نے پیغمبر کہا ہے، اس لیے ان کے نام سے جو بات بھی کہی جائے گی وہ لازماً ان کے پیغمبر ہونے کے بعد ہی کی ہو گی، یہ دوسری بات ہے کہ اس سے ہماری اپنی مطلب براری ہوئی جاتی ہے، لیکن شاید اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ گروہِ پاک کی حرمت کو دانستہ یا نادانستہ یوں استعمال کرنا منافیِ ایمان ہو۔

وما علینا الا البلاغ!

◆◆◆◆◆

تمت بالخير
و آخر دعوانا أن الحمدلله ربّ العالمين

نظامِ طاغوت سے برأت

ہر شے اپنے ضد کی دشمن ہوتی ہے، اس کا موجود ہونا اس بات کو لازم ہے کہ اس کا ضد معدوم ہو، روشنی وہاں نہیں پائی جاسکتی جہاں تاریکی مسلط ہو، اس کے پائے جانے کے لیے ضروری ہے کہ اس جگہ سے تاریکی کافور ہو جائے۔ یہ عقل اور منطق کے بدیہیّات میں سے ہے۔ اسلام بھی ایک مثبت حقیقت ہے، اور وہ بھی اپنا ایک ضد رکھتا ہے، جس کو اس کی زبان میں جاہلیت، طاغوت اور باطل وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب ہر شئے اپنے ضد کی دشمن ہوتی ہے تو عقل کہتی ہے کہ اسلام بھی اپنے ضد کو گوارا نہیں کر سکتا اور اگر دنیا میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جو اپنے ضد کے ساتھ ہم سری کر سکے، اس سے گلے مل جائے اور اس کی موجودگی میں خود موجود رہے تو اسلام کے بارے میں یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جائے گا، لازماً جہاں اسلام ہوگا وہاں جاہلیت نہ ہوگی اور جس گوشے میں جاہلیت ہوگی وہاں اسلام نہ ہوگا۔ جبر کی بات دوسری ہے۔ معذوریوں کی بحث کو ابھی نہ چھیڑیے، اپنی ذمہ داریوں کا سوال بھی ابھی خارج از گفتگو رکھیے۔ اس وقت کہنا صرف یہ ہے کہ اصولی طور پر اسلام وہیں ہوگا جہاں غیر اسلام نہ ہوگا، جہاں کفر نہ ہوگا، جہاں شرک نہ ہوگا، جہاں الحاد نہ ہوگا، جہاں طاغوت کی پوجا نہ ہوگی، جہاں جاہلیت کی کارفرمائی نہ ہوگی۔ دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا بداہتاً غلط اور ناممکن ہے۔ تضاد ان کی عین فطرت میں ہے اور تصادم اس فطرت کا عین مقتضا ہے۔